جدید بلوچی شاعری کا آغاز و ارتقا

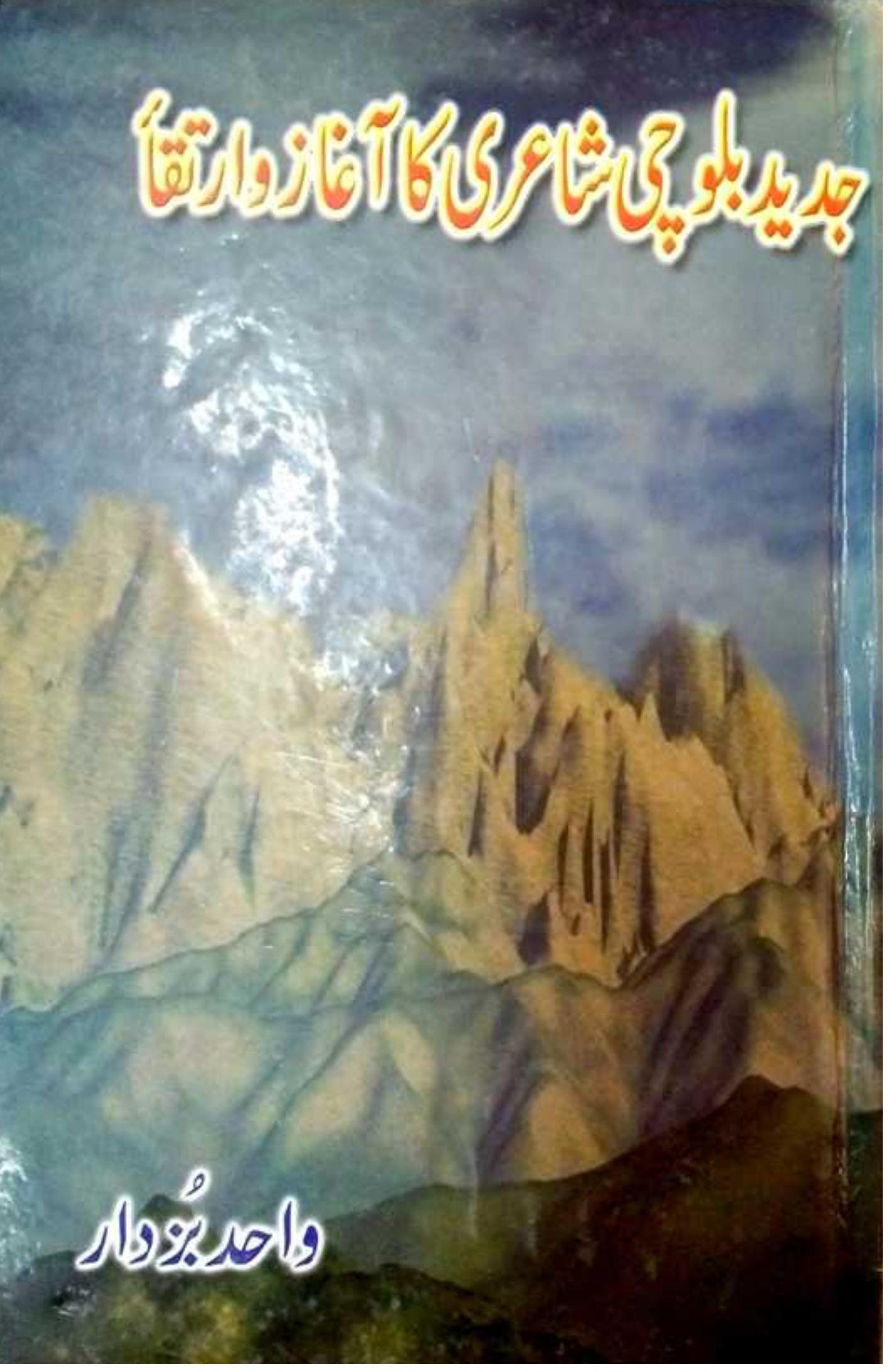

واحد بُزدار

جدید بلوچی شاعری

کا

آغاز و اِرتقاء

واحد بُردار

بلوچی اکیڈمی کوئٹہ

© بلوچی اکیڈیمی کوئٹہ

نام کتاب	:	جدید بلوچی شاعری کا آغاز وارتقاء
محقق	:	واحد بزدار
ناشر	:	بلوچی اکیڈمی
کمپیوٹر کمپوزر	:	الیاس بلوچ
چاپ جاہ:	:	المخزن پرنٹرز کراچی
سال اشاعت	:	2005
تعداد	:	500
قیمت	:	200

بہ تعاون: اکادمی ادبیات پاکستان

فہرست

عنوان	صفحہ نمبر
☆۔ حرف آغاز	1
1۔ بلوچی شاعری کا فکری اور تاریخی پس منظر	3
2۔ جدید بلوچی شاعری کی ابتداء اور سیاسی، سماجی و معاشرتی عوامل و اثرات	36
3۔ جدید بلوچی نظم کا فکری ارتقاء	60
4۔ بلوچی غزل..... تاریخ و ارتقاء	110
5۔ ماحصل	145
6۔ کتابیات	155

حرفِ آغاز

''محبت اور مزاحمت'' بلوچی شاعری کی مرکزی روایت ہے جو ایک توانا مظہر کے طور پر بلوچی شاعری کی خمیر میں رچی بسی نظر آتی ہے۔

بلوچ سماج میں شاعری کا عمل کومٹ منٹ (Commitment) کا عمل ہے۔ میر بیورگ کے بقول شاعری صرف بہادر لوگ ہی کر سکتے ہیں۔ اُن کے نزدیک بُزدل آدمی نہ تو شاعری کر سکتا ہے اور نہ ہی کوئی جنگ لڑ سکتا ہے کیونکہ بُزدل آدمی نہ تو سماج سے کوئی کومٹ منٹ رکھتا ہے اور نہ ہی اپنی ذات سے۔

جدید بلوچی شاعری بھی ''محبت اور مزاحمت'' کی اِسی مرکزی روایت کے اردگرد نہ صرف اپنے احساسات کا تانا بانا بُنتی نظر آتی ہے بلکہ وسیع کائناتی تناظر کا حامل بھی ہے، جہاں مقامیت کے دکھ کے اظہار سمیت عالمی کرب نمایاں ہے۔ اور یہ کرب کومٹ منٹ کے بغیر ممکن نہیں ہے۔

واحد بُزدار

بلوچی شاعری کا فکری اور تاریخی پس منظر

بلوچی شاعری کا فکری اور تاریخی پس منظر

دستیاب کلاسیکی شاعری جو ۱۴۵۰ء سے لے کر ۱۹۴۵ء تک تین بڑے ادوار چاکری عہد، عہد خوانین اور برطانوی عہد پر مشتمل ہے۔ کم وبیش پانچ سو سال کے اس طویل شعری سفر میں محبت اور مزاحمت کا عنصر نہ صرف غالب احساس کے طور پر اس کے خمیر میں موجود رہا ہے بلکہ مرکزی روایت کے طور پر بلوچی شاعری کے رگ وپے میں لہو کی طرح رواں دواں دکھائی دیتا ہے۔

محبت اور مزاحمت کے انہی دو طاقتور رویوں کا ذکر کیئے بغیر جدید بلوچی شاعری کے رواں لہجے اور شعری مزاج کی شناخت کو سمجھنا ممکن نہیں ہے۔ بلوچی ادب اور بلوچ معاشرہ وزندگی میں محبت کا تصور اتنا بے لوث، بے ریا اور بیکراں ہے ۔کہ وہ ایک کٹورے پانی کے بدلے میں سو سال تک وفا کی تلقین کرتے نظر آتے ہیں ۔عطا شاد نے ''تاس یے آپ بور، صد سال وفا بکن'' کے اس کلاسیکی تصور کو نہایت ہی خوبصورت انداز میں اپنی اردو شاعری میں منتقل کی ہے۔

میری زمین پر
ایک کٹورے پانی کی قیمت
سو سال وفا ہے
آؤ ھم بھی پیاس بجھائیں
زندگیوں کا سودا کرلیں۔ (عطا شاد) (۱)

دوسری طرف ان کے ہاں مزاحمت کا جذبہ بھی اتنا ہی شدید، بے رحم اور توانا ہے کہ ان کا جذبہ انتقام دو سو سال تک بھی بوڑھا نہیں ہوتا۔

بیر بلوچانی تاں دوسد سال ءَ
لسہیں آہوانت دوددنتانیں
سنگ اگاں چاتانی بناریزانت
کینگ چہ مردانی دل ءَ کنزانت (۲)

ترجمہ:۔ بلوچوں کا انتقام دو سو سال تک محو نہیں ہوتا۔ ان کا انتقام جوان ہرن کی طرح ہوتا ہے۔

گہرے کنوؤں میں پتھر تو گل سکتے ہیں۔ مگر مردوں کے سینے کی گہرائیوں میں انتقام کبھی مر نہیں سکتا۔

مزاحمت کے حوالے سے بلوچ تاریخ میں ہارین بلوچ اور بالاچ گورگیج ہمت اور رجائیت کا سمبل بن کر سامنے آئے ہیں۔ ہارین بلوچ نے اپنے بھائی کے قتل

کے بدلے میں ایک سوبیس آدمیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اور اس کا یہ قول بلوچ معاشرہ میں ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر گیا ہے کہ میں اپنے بھائی کے قتل کے بدلے میں پوری دنیا کو تو قتل نہیں کر سکتا۔ لیکن دشمنوں سے سمجھوتہ بہر طور نہیں ہو سکتا۔ چاہے وہ سات سمندر پار ہی کیوں نہ چلے جائیں۔

اسی طرح بالاچ گورگیج نے مخالف فریق کے سو 100 کے قریب آدمیوں کو قتل کرنے کے باجود بھی دشمنوں سے کسی قسم کا سمجھوتہ یا مصلحت کو خارج از امکان قرار دیا۔

تم جانتے ہو کہ
میں ''دودا'' کے قاتلوں اور اس کے دشمنوں کے ساتھ ایسا کروں گا
جس طرح باز کبوتر کے ڈار پر جھپٹتا ہے
بکریاں جس طرح ''کہور'' کی کونپلوں کو چباتی ہیں۔
گرم لو جس طرح پانی کی پتلی تہہ والے جوہڑ کے ساتھ کرتی ہے۔
سؤر جس طرح فصلوں کو تہس نہس کرتے ہیں۔
جس طرح بھیڑیا اونٹنی کے بچے کو چیر پھاڑ دیتا ہے۔
دودا ! میں تیرے قاتلوں کے ساتھ بھی
ایسا ہی سلوک کروں گا۔
اور ان کے نامور افراد کو
تہہ تیغ کروں گا۔ (۳)

بالاچ گورگیج بلوچ جذبہ انتقام کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

جن بہادروں کو دشمن سے انتقام لینا ہوتا ہے۔
وہ اپنی بیویوں کو تج دیتے ہیں۔
عاشقوں کی طرح سرد آھیں بھرتے ہیں۔
دشمنوں پر دانت پیستے ہیں۔
اور صرف ایسے ہی جواں مرد انتقام لیتے ہیں۔
یا اپنا سر گنوا دیتے ہیں۔(۴)

بلوچ محبت کے بارے میں جتنے بے لوث، بے ریا اور وسیع القلب واقع ہوئے ہیں۔دشمنی اور انتقام میں اتنے ہی بے رحم، سفاک اور شقی القلب ثابت ہوئے ہیں۔بلوچ جذبہ انتقام کے بارے میں ملا رگام وشی کہتے ہیں۔

اگر ظالموں کا سپہ سالار
مظلوموں کا محافظ بن جائے
اگر شاعر نور محمد (۵) پھر زندہ ہو جائے
اور محفلوں میں شاعروں کی قطار میں بیٹھ کر
اپنے اشعار سنانے لگے
اگر گیدڑ پرندوں کی رکھوالی کرے
کبوتر گدھوں کی ہم نشینی اختیار کرے

چیتا اونٹوں کا ساربان بنے

انتیسویں کی رات کو چاندنی ہو۔

درندہ بھیڑیا، بھیڑوں کا نگہباں بنے

بھیڑ کی اولاد جنگلی بلے بن جائیں

اگر آگ روئی کو جلانا چھوڑ دے

اگر خشخاش کا دانہ، ڈھاڈر (٦) کی

پہاڑیوں جتنا بڑا ہو جائے۔

اگر۔ ''ہمنت'' (٧) کا پہاڑ رائی جتنا چھوٹا ہو سکے

سمندر کا پانی خشک ہو

اور اس پر چلنے پھرنے کا راستہ بن جائے

اگر دریا سوکھ جائیں

اور بہتے رود گزرگاہ بن جائیں

سمندر کی مچھلیاں میدانوں میں دوڑنے پھرنے لگیں

اگر زحل اور مشتری ایک برج میں آجائیں

اگر دجال گدھے پر سوار ہو کر آجائے

اور دنیا پر یاجوج ماجوج کا قبضہ ہو جائے زمین رسی کی

ایک تار کی طرح پتلی ہو جائے

تب تیرے خلاف بغض وحسد میرے دل سے نکل سکے گا

اوراس کے بعد ہمارے درمیان صلح کی بات چیت ممکن ہو سکے گی۔(۸)

بلوچی شاعری میں محبت اور مزاحمت دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔اور کبھی کبھار یہ آپس میں گڈمڈ بھی ہو جاتے ہیں۔بلوچوں نے ہمیشہ عشق کو جنگ اور چیلنج کے طور پر قبول کیا ہے اور جنگ کو عشق سمجھ کر اپنی زندگیوں میں برتا اور نبھایا ہے۔

چاکری عہد میں بلوچ رندولاشار کے نام پر دو گروہوں میں بٹ کر تیس سال تک (خواہ اس کی وجوہات کچھ بھی ہوں) کافر دیوتاؤں کی طرح آپس میں لڑتے اور مرتے رہے۔خاک وخون اور انتقام کی اس طویل جنگ نے نہ صرف ان کی خوبصورت تلواروں اور خنجروں کی چمک دمک کو گہنا کر رکھ دیا بلکہ بقول ان کے اپنی ہی گردنیں کاٹتے کاٹتے یہ اس حد تک ٹیڑھی ہوگیں کہ ان کو میانوں میں سمانا مشکل ہوگیا۔

گنتی کے پورے تیس سال
ھم آپس میں لڑتے رہے
جنگی ترکشوں کے تیروں سے
ہمارے جسم چھلنی ہوئے
ہماری تلواروں پر خون کی تہیں جم گئیں
اور وہ گنے کی گانٹھوں کی طرح ٹیڑھی ہوگئیں۔
اب وہ خوش نما میانوں میں سما نہیں سکتیں
وہ نوجوان جو دہرے خود پہنا کرتے تھے

جوایک خاص بانکپن سے
اپنے سروں پر دستار سجایا کرتے تھے
اور اپنی مونچھوں پر مشک ملتے تھے
جو گھوڑوں کو بنا لگام دوڑاتے
دمبوں کی چکیاں کھاتے
اور عمدہ شراب پیتے تھے
آج ان میں سے ایک بھی نظر نہیں آتا
ان سب کو ہندی تلواریں چر چکی ہیں۔
وہ تلواروں کی تیز گھاٹ اتر چکے ہیں۔ منحوس شرطوں
اور بچگانہ لہو ولعب میں
ہم انہیں ہار چکے ہیں۔
آج ان کے گلوں کا رکھوالا کوئی نہیں
اور نہ ہی باغی قلعوں کو
سر کرنے والا کوئی نوجوان باقی ہے۔(۹)

''جنگ جہاں نہ صرف موت اور زندگی کے درمیان کا فاصلہ مختصر ہو جاتا ہے۔ بلکہ وہاں موت اپنی پورے جوبن کے ساتھ ہر طرف رقص کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ جس سے انسان یقینی طور پر خود کو موت کے قریب ہوتے ہوئے محسوس کرتا ہے۔ جنگ تو بہر حال جنگ ہوتی ہے۔ عام حالات میں بھی انسان موت کے

امکان کو سمجھنے کے باوجود اس تصور سے دور رہنے کی کوشش کرتا ہے"۔(۱۰)

لیکن چاکری عہد میں ہم دیکھتے ہیں کہ ہر جنگ کے بعد لڑنے اور مرنے کا جوش و جذبہ، زندگی کی امنگ اور تڑپ پہلے کی نسبت کچھ زیادہ ہی دکھائی دیتا ہے۔

ہم وہی پتلی گھوڑیوں والے رند ہیں
جو کبھی زین پر ہوتے ہیں
اور کبھی (شکست کھا کر) نقصان اٹھاتے ہیں
اور کبھی (فتح یاب ہو کر) تین گنا فائدہ اٹھاتے ہیں۔(۱۱)

کسی ایک موقع پر جب میر بیبرگ نے بلوچوں کو جنگ کرنے سے روکنا چاہا تو زور آور جنگجو اور مہم جو سورماؤں نے ان کی فہم و فراست کو اس کی بزدلی اور کم ہمتی قرار دیکر ان پر لعن طعن کی بارش کر دی۔

بی برگ! تجھے خدنگوں نے سہا دیا ہے
ہندی تلواروں نے تجھے چکرا دیا ہے۔
نیزوں اور ٹیڑھی دھاروں والے خنجروں نے
تجھ پر معیادی بخار طاری کر دیا ہے۔
میدان جنگ میں جب ہم شمشیر زنی کے جوہر دکھائیں گے
تو تجھے تیروں کی پہنچ سے ہم دور بٹھا دیں گے
اگر غلطی سے کوئی تیر
تیری طرف آ بھی جائے

اسے ہم اپنی طرف پھیر دیں گے

ہم (رند) اور شمشیر زن لاشاری

اس طرح آپس میں ٹکرائیں گے

جیسے سیلاب کا شہ زور پانی بند سے ٹکراتا ہے

جوار کے خوشوں کی طرح

ہم ایک دوسرے کا سر کاٹتے رہیں گے

تم دور بیٹھ کر صرف تماشہ دیکھو

کہ ملا کس فریق کے لیے فاتحہ پڑھتے ہیں۔(۱۲)

زندگی اور فطرت کی روح پرور تصور ہی کی طرح قدیم روایتی بلوچ معاشرہ میں جنگ کا تصور بھی حیران کن حد تک خوش کن اور مسحور کن رہا ہے۔ کیونکہ عام طور پر بلوچ سورماء کسی جنگ میں شریک ہونے سے پہلے خود کو دولہا کی طرح سجاتے ،سنوارتے اور ایک سج دھج کے ساتھ میدان جنگ کا رخ کرتے۔

میدان جنگ کی طرف جاتے ہوئے یہاں ایرانی بلوچستان کے نامور شاعر احمد واجو کا انداز ملاحظہ کیجیے۔

؎ میں نے کمر کس کر ہتھیار باندھے

چالیس مہروں والا چھرا

چاندی کے دستے والی کٹار

اور دشمنوں کے سر غنوں کو کاٹنے والی

آدم خور تلوار سجالی

اور اپنے آپ کو

دولہے کی طرح میں نے سجایا اور سنوارا۔ (۱۳)

اور یہی بات رحملی مری، بلوچ بہادروں کے متعلق کہتا ہے۔ جب وہ اپنی انداز ووقار کے ساتھ انگریزی سپاہ سے لڑنے جارہے تھے تو دوسری طرف انگریز بلوچوں کی سج دھج دیکھ کر یہ تصور کررہے تھے کہ شاید وہ کسی شادی بیاہ کی تقریب میں شرکت کرنے جارہے ہیں۔

؎ مری بلوچوں نے اپنی داڑھیوں پر خوشبو

اور مونچھوں پر عطر ملا

تن بدن کو مخمل اور نبات کی پوشاک سے ڈھانپا

اور گھوڑوں کو پشمینہ پھولوں سے سجایا۔ (۱۴)

یا انگریزی فوج کی لشکر کشی کی خبر پا کر مری بلوچ ان سے جنگ لڑنے کے لیے اپنی بے پناہ مسرت اور والہانہ جذبہ اور لگاؤ کا اظہار یوں کرتے ہیں۔

؎ کاہان سے تیز رو قاصدوں کے ذریعے

بلوچوں کو اطلاع دے دی گئی

شمال اور جنوب اور چاروں اطراف سے

بادلوں کی طرح امڈ امڈ کر

لشکر جمع ہونا شروع ہوئے

اور خوشی سے ان کے چہرے

چودھویں چاند کی طرح دمک رہے تھے۔(۱۵)

والئی قلات خان میر محراب خان جو انگریزوں کے ساتھ دو بدو جنگ میں بنفس نفیس شریک تھے۔ اور میدان جنگ میں مردانہ وار لڑتے ہوئے شہید ہوئے تھے۔ ملا بو ہیر میر واڑی انگریزوں کے خلاف خان میر محراب خان کی مزاحمتی کردار اور ان کی جنگی وقار و افتخار کا نقشہ کچھ اس طرح کھینچتے ہیں۔

موسلا دھار مینہ برسانے والے

بادلوں کی طرح

بندوق اور توپ گرجنے لگے

محل اور قلعہ نما بادگیر پر

دشمن نے قبضہ کر لیا

شاہانہ لڑائی مچ گئی

سلطانی شان و شوکت رکھنے والا خان

غضب میں آ کر غرانے لگا

اس نے سنجاب کا شاہی لباس

تاج اور زیور پہن لئے تھے

چنان جیسی ڈھال کو

ہاتھ میں لے کر تلوار کھینچ لی

اور یا علیؓ کا نعرہ لگاتا ہوا

دشمن پر ٹوٹ پڑا۔ (۱۶)

جنگ کو عشق کے طور پر قبول کرنے اور اسے اپنی زندگی میں برتنے کے اس روایتی بلوچ تصور کے ضمن میں قدیم بلوچی شاعری سے بیسوں مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔ لیکن ہم طوالت کے خوف کے باعث صرف یہاں گاہی گورگیج کے ان اشعار پر ہی اکتفا کرتے ہیں۔ جن میں وہ بلوچ فلسفۂ جنگ کی بھرپور نمائندگی کرتے نظر آتے ہیں۔

بزدل آدمی لڑائی کو دیکھ کر
وحشی دنبے کی طرح بدک جاتے ہیں۔
یہ صرف عاشقوں کا کام ہے۔
جو ہنسی خوشی
میدان جنگ کا رخ کرتے ہیں۔
توکل کی کشتی کو دل سے دھکیلتے ہیں
اپنے قد بالا کو زرہ پوش کرتے ہیں۔
اور زہر کے اس پیالہ کو
جام شراب کی طرح
نوش جاں کرتے ہیں۔ (۱۷)

بلوچ اپنے ارتقاء کے سفر میں وقت کے جبر کے ہاتھوں زندگی اور موت کے

درمیان گھٹتے اور بڑھتے فاصلوں سے اس قدر مانوس ہوتے گئے کہ ان کے لیے زندگی اور موت کے درمیان کوئی حد فاصل قائم کرنا ممکن نہیں رہا۔ وہ حیاتیاتی سطح پر یکساں اعتبار سے زندگی اور موت سے لطف اندوز ہوتے رہے۔ اور زندگی ہی کی طرح وہ موت کی آنکھوں سے بھی لذت اور مسرت کشید کرتے رہے۔

اس لیے ہم دیکھتے ہیں کہ بلوچوں نے موت سے خائف اور خوف زدہ ہونے کی بجائے اسے ہمیشہ ایک عام اور سادہ سی حقیقت سمجھ کر قبول کیا ہے۔ وہ جتنی آسانی اور حوصلہ و جرات سے زندگی کو (Face) کرتے ہیں۔ اس سے کہیں زیادہ آسانی اور حوصلہ و ہمت سے موت کو (Face) کرنے کے قائل ہیں۔

بلوچ صرف اور صرف چھوٹی سہل اور حقیر موت سے خوف زدہ رہے ہیں ۔چھوٹی اور سہل موت کے تصور سے ان کو گھبراہٹ اور وحشت ہوتی تھی۔ بخار سے مرنے کا خوف انہیں اس حد تک مضطرب اور پریشان کئے رکھتا کہ وہ دعائیں کیا کرتے تھے کہ خدا انہیں بخار کی موت سے بچالے۔

بلوچ معاشرہ میں یہ بات ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر چکا ہے کہ "اگر ان کے مقدر میں سانپ کے ہاتھوں ڈس کر مرنا ہی ہے تو چھوٹے سانپ کی بجائے اسے کوئی بڑا سانپ ہی ڈس لے اور یہ بات بھی ان کے ہاں ضرب المثل بن گیا ہے کہ ((مردانی مرگ دہ شادے)) یعنی بہادروں کی موت بھی جشن سے کم نہیں ہے۔

"چاکری عہد کے لوگ بے نام اور عام سی موت مرنے کی بجائے غیر معمولی موت سے ہم کنار ہونے کی خواہش رکھتے تھے۔ یہ لوگ ایک ایسی موت مرنا چاہتے

تھے۔ جہاں وہ لوگوں کے دلوں میں مدتوں زندہ رہ سکیں' اس لیئے انہیں بے نام' سہل' حقیر اور چھوٹی موت سے گھبراہٹ اور وحشت ہونے لگتی تھی۔ موت سے خائف یا خوف زدہ ہونے کے برعکس وہ لوگ نہ صرف موت کے شعور پر یقین رکھتے تھے۔ بلکہ اس سے نبرد آزما ہونے کا حوصلہ اور ہمت بھی رکھتے تھے۔'' (۱۸)

وہ سمجھتے تھے کہ بڑی موت اُن کے لیئے تاریخی طور پر زندہ رہنے کے امکان مہیا کرتی ہے۔ موت کا شعور اور حیات پسندی کا یہ تصور نہ صرف ان کی زندگی میں نمایاں ہے بلکہ اُن کا فن بھی حیات پسندی اور حیات افروزی کا وہ مظہر ہے۔ جہاں مرثیہ اور قصیدہ کا تصور بھی ناممکن ہے۔

چاکری دور میں بلوچ تیس سال تک آپس میں لڑتے اور کٹتے رہے۔ اور ۱۸۳۹ء سے لے کر ۱۹۲۰ء تک وہ انگریزوں کے خلاف پورے اسی سال تک مزاحمت کرتے رہے۔ ان ادوار میں سینکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں کے حساب سے لوگ تہہ تیغ ہو گئے۔ اتنی تباہی اور قتل و غارت کے باوجود ہمیں بلوچی شاعری میں مرثیہ کا ایک لفظ بھی ڈھونڈنے سے نہیں ملتا۔

قصیدہ نگاری کے متعلق کوئی لمبی چوڑی بات کرنے کی بجائے صرف اتنا ہی عرض کیا جا سکتا ہے کہ ''بلوچ شاعر اپنے بہادر دشمن کی تعریف کرنا تو پسند کر سکتا ہے۔ لیکن سردار کی نہیں۔'' (۱۹)

جنگ کے روایتی تصور کی طرح بلوچوں کے ہاں محبت کا تصور بھی بڑا جارحانہ رہا ہے۔ ایک کٹورے پانی کے بدلے میں سو سال تک وفا کرنے کی روایت سمیت

ان کے یہاں پیار و محبت کے عام معاملات میں بھی روایتی بلوچ بہادری و دلیری اور محبوب کو ہر صورت میں حاصل کرنے کا فاتحانہ اور سرفروشانہ جذبہ دیکھنے میں ملتا ہے۔

مثلاً جب ہانی، شہ مرید کو منع کرتی ہے کہ وہ میر چاکر کے پہریداروں کی موجودگی میں یوں سرعام اس سے ملنے نہ آیا کرے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ میر چاکر کے پہریدار اسے قتل کر ڈالیں۔ تو شہ مرید، ہانی کے جواب میں کہتے ہیں۔

؎ میں مبارک کا نونہال بیٹا ہوں
نہ تو ماں نے مجھے ایسا دودھ پلایا ہے
اور نہ ہی میری دایہ نے مجھے ایسی لوریاں دی ہیں
کہ میں میر چاکر سے اپنا سر چھپاتا پھروں۔ (۲۰)

اسی طرح جب میر بیرگ جوری چھپے ''گراں ناز'' سے ملنے کی خاطر ان کے کئی منزلہ خواب گاہ تک رسائی حاصل کرتے ہیں۔ تو گراں ناز میر بیرگ کو امیر قندہار کی طاقت وسطوت اور جاہ وحشمت کا خوف دلاتی ہوئی کہتی ہیں۔

؎ اے گھبرو! تجھے یہاں تقدیر کھینچ لائی ہے
ترک! تیرا یہ باغی سر کاٹ کر
قلعے کے دروازے پر لٹکا دیں گے۔ (۲۱)

تو اس کے جواب میں میر بیرگ کہتے ہیں۔

؎ کون میری سانڈ جیسی گردن کاٹ کر
قلعے کے دروازے پر لٹکا سکتا ہے

میں ان بھوکے چوروں میں سے نہیں ہوں
جو چھرے نکال کر دنبوں کو گھیر لیتے ہیں
اور ان کی چکیاں کاٹ کر
کچا چبا لیتے ہیں
میں تو بی برگ ہوں
وہی بی برگ جن کا ذکر
اشعار میں ہوتا ہے۔ (۲۲)

اس طرح کا ایک اور واقعہ بھی میر بی برگ سے متعلق ہے۔ جب وہ ایک رات اپنی محبوبہ سے ملنے جاتا ہے تو علی الصبح اس کی محبوبہ اسے جگا کر کہتی ہے کہ اٹھو صبح ہوگئی ہے۔ اب یہاں سے چلنے کی کرو۔ تب میر بی برگ ان سے کہتے ہیں کہ میں محبوباؤں کو چھوڑ کر جان بچانے والوں میں سے نہیں ہوں۔

صبح کا ظالم ستارہ طلوع ہوا
اور کمان سے پھینکے ہوئے تیر کی طرح
چمکتا ہوا اوپر کو اٹھنے لگا
تب اس محبوبہ نے
آہستہ سے اپنا چوڑیوں سے بھرا
اور ہاتھی دانت کی طرح سفید ہاتھ
میرے سر کے نیچے سے کھینچ لیا

اور گونگوں کی طرح

ہاتھوں سے اشارہ کرتے ہوئے کہنے لگی

اے نوجوان اٹھ!

کہ سپیدہ سحر نمودار ہوا

ہم دونوں نیک نام لوگ ہیں

کہیں ایسا نہ ہو

کہ بدنام ہو جائیں۔ (۲۳)

تب میر بی برگ نے اس کے جواب میں کہا۔

یہ تو تیرے بزرگوار باپ کی عادت ہے

جو محبوبہ کو چھوڑ کر

گھر سے نکل بھاگتا ہے

میں تو ایک انچ بھی

پیچھے نہیں ہٹوں گا

کیونکہ چھوکروں کی طرح پیچھے ہٹنا

میرے لئے عیب کی بات ہے۔ (۲۴)

محبت کے بارے میں یہ جارحانہ جذبہ چاکری عہد کے بعد کے شعرا کے ہاں بھی اسی شدت کے ساتھ نمایاں ہے۔ اس سلسلے میں چند شعرا کا کلام ملاحظہ کیجیے۔

اگر تم چودھویں کا چاند ہو

تو میں چاند گرہن ہوں
اگر تو بجلی کا کوندا ہے
تو میں کالی گھٹا ہوں
اگر تم کالی ناگن ہو
تو میں جوگی بن کر
پیار کی مرلی بجا بجا کر
تم کو ہاتھ سے پکڑوں گا
اگر تم میدان میں کھلنے والے پھول ہو
تو میں تتلی بن کر
تم پر منڈلاتا رہوں گا۔ (جام درک)(۲۵)

میں اس دن
تم سے دست بردار ہو جاؤں گا
جس دن
قطب کا ستارہ بھی
گردش کرنے لگ جائے
اور سہیل کا ستارہ

مغرب سے طلوع ہو جائے
میر چاکر کی ماڑی کے نیچے
صدیاں گزر جائیں
تب میری امیدیں
تم سے ٹوٹ سکتی ہیں۔ (جمشید مری) (۲۶)

؎ اہل (محبوب) اگر زیور ہے
تو میں اس کا خریدنے والا سوداگر ہوں
اگر اس کی قیمت ہزاروں میں ہے
تو میں اسے لاکھوں میں خریدوں گا
اگر محبوب ایک پرندہ ہے
تو میں باز بن کر
اسے پکڑوں گا
اگر (اہل) محبوب سانپ ہے
تو میں اسے ہاتھ سے
پکڑنے والا جوگی ہوں۔ (خانے بزدار) (۲۷)

میر حمل رند نے ایک جگہ روایتی بلوچ عاشق کے کردار کو شیر کے مماثل قرار

دیتے ہوئے کہا تھا کہ

عاشقیں مردءُ شیر شکارانی

دائما چوں ہونی ءَ گوئر کائنت۔ (۲۸)

ترجمہ: جواں مرد عاشق اور شکار کھیلنے والے شیر ہمیشہ خونی دشمن کی طرح ٹکراتے ہیں۔

محبت، بہادری اور شاعری بلوچ کلچر (Culture) کے تین بنیادی ستون ہیں۔ مزاحمت ہی کی طرح محبت اور شاعری کا عمل بھی ان کے ہاں بہادری کے تقاضوں سے مشروط نظر آتا ہے۔ ان کے نزدیک محبت اور شاعری صرف بہادر لوگ ہی کر سکتے ہیں۔ بزدل آدمی نہ تو شاعری کر سکتا ہے اور نہ ہی محبت کر سکتا ہے۔ کیونکہ مضبوط وابستگی اور بھرپور کومٹ منٹ (Commitment) کے بغیر نہ تو شاعری کا تصور ممکن ہے اور نہ ہی محبت کا۔

اپنے عہد کے عظیم ہیرو اور نامور شاعر میر بیبرگ نے بجا طور پر کہا تھا کہ

شیرَاں ھما مردگش انت

کہ وت موہری داوا گرانت۔ (۲۹)

ترجمہ: شاعری تو وہی لوگ ہی کر سکتے ہیں۔ جو جنگ میں سب سے آگے ہوں۔

جنگ خواہ اجتماعی معاشرت کی ہو یا انفرادی محبت کی، سماج کو خوبصورت بنانے کی ہو یا بدصورتی یا بدوضعی کو مٹانے کی ہو، بھرپور وابستگی کے بغیر کوئی بھی لڑائی لڑی نہیں جا سکتی۔ بلوچوں کے نزدیک بزدلی، کم ہمتی اور بے حمیتی کا عمل اس لیے قابل

نفریں عمل رہا ہے کہ بزدل آدمی نہ سماج سے کوئی کومٹ منٹ (Commitment) رکھتا ہے۔ اور نہ ہی اپنی ذات سے۔

باجو باالخیر، شمس الدین اور اللہ یار بلوچ تاریخ میں اس لیے مطعون اور معتوب ٹھہرے کہ ان کی موجودگی میں ان کے پناہ میں آئے ہوئے ساتھی قتل کیئے گئے۔ لیکن وہ اپنے ہاں پناہ حاصل کرنے والوں کی زندگیوں کو تحفظ دینے میں ناکام رہے۔ جبکہ گزوچنو نے اپنے بھائی کے قتل کا بدلہ لینے کی بجائے ان کے قاتلوں سے صلح کی تھی۔ مگر اس کی سوتیلی بہن نے اس بے حمیتی کے فیصلے سے انحراف کرتے ہوئے ایک کمزور عورت ہوکر بھی قاتلوں میں سے ایک کو قتل کر کے اپنے بھائی کے قتل کا حساب برابر کرلیا۔

ملا اسماعیل نامی ایک نامور بلوچ شاعر انہی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اپنے بزدل دشمن سے مخاطب ہوکر کہتے ہیں کہ۔

تم تو بالکل شمس الدین
اور اللہ یار بنے بیٹھے ہو
تم تو باجو باالخیر سے بھی
دو ہاتھ آگے بڑھ گئے ہو
اور گزوچنو کی سوتیلی
اور یتیم بہن سے بھی گئے گزرے ہو
بدنامی اور رسوائی کا داغ

سات پشتوں تک

تیرے ساتھ رہے گا۔(۳۰)

مگر اس کے برعکس بلوچ تاریخ میں بالاچ گورگیج کے عمل اور اس کی مزاحمتی کردار کو اس لیے سراہا گیا۔کہ وہ بہادروں کی طرح جیئے اور بہادروں کی طرح مرے۔اس نے زندگی بھر بزدلی، کمزوری اور کسی قسم کی مجبوری، خوف اور مصلحت کو اپنے قریب پھٹکنے نہیں دیا

بالاچ گورگیج کی مزاحمتی کردار سے متاثر ہوکر ایک بلیدی شاعر نے کہا تھا۔

؎ بالاچ! غرور صرف تجھے ہی زیب دیتا ہے۔

تیرے دشمنوں کو نہیں۔

ان کے لیے تو زہر قاتل ہے۔

تم ہر روز اپنے دشمنوں پر

ایسا قہر ڈھاتے ہو کہ

مائیں اپنے بیٹوں کے لیے

پریشان ہیں۔

بہنیں اپنے کھڑی مونچھوں والے

بھائیوں کے لیے

ساس اپنے دامادوں کے لیے

اور بیویاں

اپنے پیارے خاوندوں کے لیے

حیران و پریشان رہتی ہیں۔(۳۱)

بلوچ تاریخ میں گراں ناز نامی خاتون نے غلط فہمی میں اپنے شوہر للہ کو محض اس بنا پر مسترد کر کے اپنا بیٹا قرار دیا۔ کہ وہ میدان جنگ میں دشمنوں کا مقابلہ کرنے کی بجائے بزدلوں اور چوروں کی طرح جان بچا کر واپس آیا ہے۔ حالانکہ ''للہ'' جنگ میں بڑی بہادری کے ساتھ لڑتا ہوا شدید زخمی ہوا تھا۔ مگر گاؤں میں غلط اطلاع آنے اور صورت حال کو مکمل طور پر سمجھنے اور جاننے سے پیشتر گراں ناز نے یہ فیصلہ کر لیا کہ کوئی بزدل اور بے غیرت اس کا شوہر نہیں ہو سکتا۔

''ابھی چند دنوں کی بات ہے کہ میں اپنی سہلیوں سے تمہاری بہادری کا تذکرہ کر کے فخر محسوس کرتی رہی اور ہمیشہ یہ سوچتی رہی کہ تو شیر کی موت مرے گا۔ اور تیرا نام بہادر جیالوں میں سرفہرست ہوگا۔ اس صورت میں مجھے اپنے تمام زیورات کو اتار کر ہمیشہ کیلئے بند کرنا پڑتا۔ اور سوگ میں بیٹھ کر تمھارے دشمنوں کے گاؤں کو تکتی رہتی۔''(۳۲)

گراں ناز آگے اپنے جذبات کا اظہار کرتی ہوئی کہتی ہیں کہ

''جب بھی جنگ اور لڑائی جاری ہو اور دشمنوں سے زور آزمائی ہو تو بہادر اور غیور لوگ حسیناؤں کی یادوں کو بالائے طاق رکھتے ہیں۔ مگر تمہیں (للہ) اس وقت حسیناؤں کی مجلس، آرام دہ اور خوش نما گھر، الہڑ دوشیزاؤں کی چھیڑ خانیاں اور زیادہ تر میری میٹھی باتیں یاد آتی رہیں۔ اب تم میرے شوہر کی بجائے میرے بیٹے کی مانند ہو۔

جسے میں نے دودھ پلا کر پالا ہو۔ اب تم روز محشر تک میرے زیورات کے باپ اور بھائی رہو گے۔'' (۳۳)

اس طرح دودا گورگیج کی ماں نے اپنے ہمسائیگی میں رہنے والی سمی نامی مالدار خاتون کے ڈھور ڈنگر چوری ہونے پر اپنے بیٹے دودا گورگیج کو نیند سے جگا کر سختی سے یہ تاکید کی کہ یا تو وہ رہزنوں سے سمی کے چرائے ہوئے ڈھور ڈنگر واپس لے آئے یا اسی تگ ودو میں اپنی جان قربان کرے۔

؎ میں پورے نو ماہ تک
تجھے اپنی کوکھ میں پالتی رہی
اور تجھے دو سال تک
بلوچی ماں کا دودھ پلاتی رہی۔
میری ممتا کا دودھ تجھ پر حرام ہو۔
یا اسی تگ ودو میں
اپنی جان قربان نہیں کرتے۔ (۳۴)

اور یہی ہوا کہ دودا گورگیج رہزنوں کا تعاقب کرتے ہوئے مارا جاتا ہے۔ اور اس کی لاش کو گھر لایا جاتا ہے۔ لیکن اس کی بوڑھی ماں اپنے لخت جگر کی لاش کے سرہانے سر جھکا کر ماتم کناں نظر نہیں آتی۔ بلکہ اس کا سر فخر سے کچھ اور اونچا دکھائی دیتا ہے۔ اور اس کے چہرے کی جھریوں میں ملال اور دکھ کی بجائے بزرگی اور وقار کا احساس جھلکتا نظر آتا ہے۔

محبت اور مزاحمت کے حوالے سے قدیم بلوچی شاعری کی یہ مثالیں ایک طرف ہمیں لوک شاعری میں بھی جا بجا اس قسم کے رویے اور رجحان ملتے ہیں۔ ڈیہی ،لیکو، زہیرگ کو چھوڑیئے وہ تو ہے ہی محبت اور مزاحمت کی شاعری۔ ہمیں لوری جو بنیادی طور پر مادرانہ محبت وشفقت سے بھرپور نفیس اور لطیف جذبوں اور احساسات کی شاعری ہے، میں بھی اس قسم کا اظہار دیکھنے میں ملتا ہے۔ جہاں مائیں اپنے بچوں کو درازی عمر اور تخت و بخت کی دعائیں دینے کی بجائے یہ آرزو اور خواہش کرتی ہیں کہ اس کا بیٹا ''چھ بلوچی ہتھیار'' سجانے کے قابل ہو سکے۔ رزم گاہ میں دشمنوں کی صفیں پلٹا دینے والا سورماء بنے۔ وہ فتح مند، شہسوار، انتقام جو، غیرت مند اور قول واقرار کا صادق بنے۔

یہاں ایک ایسی ہی ''لوری'' ملاحظہ کیجیے۔

؎ جنگ کے نازک لمحات میں
تیرا سر ہو اور تلوار کی چھاؤں
مجھے توقع ہے کہ
تو جوانمردی کا مظاہرہ کرے گا
جس طرح بہنوں کو
اپنے بھائیوں سے ہمدردی کی توقع ہوتی ہے۔
جس طرح معشوق کو
عاشق کی محبت کا یقین ہوتا ہے۔

قوم کو تیری بلوچ حمیت پر بھروسہ ہے۔

مجھے یقین ہے کہ

تو میری لوری کا پاس کرے گا۔(۳۵)

یہاں ایک اور ''لوری'' دیکھیے ۔جس میں ایک ماں اپنے بیٹے کے لیے دلیرانہ اور سرفروشانہ موت کی تمنا کرتی ہے۔

؎ میں اپنے لعل کو لوری سناتی ہوں

میں لوری دیتی ہوں اپنے لعل کو

تو میری آرزوں اور امنگوں کا

گوہر مقصود ہے

میری دعا ہے کہ

تو نامور اور شمشیر زن بنے

تا کہ تیرے باپ کا سر

فخر سے بلند رہے

میں اپنے لعل کو لوری سناتی ہوں۔

میں لوری دیتی ہوں اپنے لعل کو

تو میری آنکھوں کا نور ہے۔

میرے دل کا سرور ہے۔

میدان جنگ میں

اگر تو نے بہادری سے لڑتے ہوئے

اپنی جان دے دی

اور شمشیر زنی میں

اپنا نام و مقام پیدا کی

تو تجھ سے میرا وعدہ ہے کہ

میں اپنے پیچ دار زلفوں کو

اور گرہ گیر کروں گی

تیرے قبر پر

فاتحہ اور مرثیہ پڑھنے کی بجائے

رقص کروں گی

اور شادی و مسرت کے

گیت گاؤں گی۔(۳۶)

محبت اور مزاحمت جہاں ایک طرف بلوچی شاعری کی مرکزی روایت ہے۔ وہیں پہ دوسری طرف سچائی اور دیانت بلوچی شاعری کا اجتماعی ضمیر اور آواز ہے۔ بلوچی شاعری نے مشکل سے مشکل حالات میں بھی تاریخ اور اس کے صداقتوں اور سچائیوں کا ساتھ دیا۔ حرف و لفظ کی حرمت اور تقدس کا خیال رکھا۔

رحملی مری نے جہاں اپنی شاعری میں انگریزوں کے ہاتھوں شہید ہونے والے بلوچ سورماؤں کی ہمت اور جرات کو خراج تحسین پیش کیا۔ وہیں پہ انہوں نے

نام لے لے کر ان انگریز سپاہیوں کی بھی تعریف وستائش کی جو بلوچوں کے ساتھ بہادری سے لڑتے ہوئے مارے گئے۔

دوسری طرف انگریز سپہ سالار سر چارلس نیپیئر اپنی لاشیں اٹھاتے وقت اپنے کچھ سپاہیوں کی کلائیوں پر لپٹے ہوئے قرمزی دھاگوں کا سبب جان کر ایک عجیب اور خوشگوار حیرت سے دوچار ہوئے، جب انہیں بتایا گیا کہ یہ آپ کے وہ سپاہی ہیں جو میدان جنگ میں بلوچوں کے ساتھ بڑی بہادری اور بے جگری سے لڑتے ہوئے مارے گئے۔ اور بلوچوں نے ان کے بہادری، عزم اور حوصلہ کے اعتراف میں ان کی کلائیوں پر قرمزی دھاگے لپیٹ لیئے۔ تاکہ ان بہادوں کی موت ان بزدلوں سے مختلف نظر آسکے جو مرنے سے پہلے مر گئے تھے۔

"سر چارلس نیپیر کے ساتھ فرانس ڈی ویلس (Francis Devalis) نامی ایک انگریز شاعر بھی تھا۔ اس نے اس لڑائی سے متعلق ایک طویل رزمیہ نظم بھی لکھی ہے۔ جو اگرچہ ہمیں مکمل طور پر دستیاب نہیں ہوسکی۔ لیکن اس کا وہ حصہ جو ان قرمزی دھاگوں سے متعلق ہے۔ کسی اور حوالے سے ہاتھ آیا ہے (۳۷)

جو اس طرح سے ہے۔

ترجمہ:۔ اور جب ہم نے
ان کی لاشیں دیکھیں
جو ہوا سے دھوپ میں پڑی
سفید ہو رہی تھیں

ان کی جڑی ہوئی دونوں کلائیوں پر
اظہار فخر کے لیے
قرمزی دھاگہ لپٹا ہوا تھا
اس دلیرانہ اقدام پر
نپئیر کے دل کی انتہائی گہرائیوں سے
صدائے آفرین بلند ہوئی
تب اس نے کہا
کہ اس واقعہ کی
دائمی یادگار رہنی چاہیئے
تاکہ وہ لوگ جو بھاگے ہیں۔
اسے پڑھ لیں۔(۳۸)

چاکری عہد سے لے کر قیام پاکستان سے چند سال پہلے تک کی بلوچی شاعری کی روایت انہی مذکورہ بالا شعری رویوں اور رجحانات کا خمار تھا۔ اور قیام پاکستان کے بعد ''محبت اور مزاحمت'' کا یہی رویہ ایک نئی رومانیت اور ایک نئی مزاحمت میں ڈھلتا نظر آتا ہے۔ یہ نئی رومانیت اور نئی مزاحمت پورے بنی نوع انساں سے محبت سمیت استحصال، طبقاتی جبر و امتیاز، ظلم و تشدد، عدم مساوات، ناانصافی و نابرابری اور ہر قسم کی بدصورتی اور بدوضعی کے خلاف ایک اجتماعی اور عالمگیر اظہار کی حیثیت رکھتا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ عطا شاد، سنگاب، کوئٹہ، سیلز اینڈ سروسز ۱۹۸۵ء ص ۱۲۳

۲ میر گل خان نصیر، بلوچی رزمیہ شاعری، کوئٹہ، بلوچی اکیڈمی ۱۹۷۹ء ص ۱۱۴

۳۔ میر گل خان نصیر، بلوچی رزمیہ شاعری، ص ۱۲۲

۴۔ _____ ایضاً _____ ص ۱۱۶

۵۔ ایرانی بلوچستان (بم پشت) کا نامور بلوچ شاعر

۶۔۷ بلوچستان کے دو مشہور اونچے پہاڑوں کے نام

۸۔ میر گل خان نصیر، بلوچی رزمیہ شاعری، کوئٹہ، بلوچی اکیڈمی ۱۹۷۹ء ص ۱۱۲، ۱۱۳

۹۔ میر گل خان نصیر، بلوچستان کی کہانی شاعروں کی زبانی، کوئٹہ، بلوچی اکیڈمی ۱۹۷۶ء ص ۷۰، ۷۱

۱۰۔ واحد بزدار، قدیم بلوچی شاعری کا تنقیدی جائزہ، اسلام آباد، قومی ادارہ برائے مطالعہ پاکستان قائداعظم یونیورسٹی ۱۹۹۷ء ص ۱۱۴

۱۱۔ میر گل خان نصیر، بلوچی رزمیہ شاعری، کوئٹہ، بلوچی اکیڈمی ۱۹۷۹ء

ص ۶۳

۱۲۔ میر گل خان نصیر، بلوچی رزمیہ شاعری، ص ۴۰۔۴۱

۱۳۔ _____ ایضاً _____ ص ۲۶۹، ۲۷۰

۱۴۔ _____ ایضاً _____ ص ۲۸۹

۱۵۔ _____ ایضاً _____ ص ۲۸۸

۱۶۔ _____ ایضاً _____ ص ۲۲۱

۱۷۔ _____ ایضاً _____ ص ۱۹۱

۱۸۔ واحد بزدار، قدیم بلوچی شاعری کا تنقیدی جائزہ، اسلام آباد، قومی ادارہ برائے مطالعہ پاکستان، قائداعظم یونیورسٹی ۱۹۹۷ء ص ۱۱۱

۱۹۔ سید فیاض محمود، (مدیر خصوصی)، تاریخ ادبیات مسلمانان پاک و ہند (جلد چہاردم لاہور، پنجاب یونیورسٹی ۱۹۷۱ء ص ۳۶۶

۲۰۔ میر گل خان نصیر، بلوچستان کی کہانی شاعروں کی زبانی، کوئٹہ، بلوچی اکیڈمی ۱۹۷۶ء ص ۱۴۴

۲۱۔ میر گل خان نصیر، بلوچستان کی کہانی شاعروں کی زبانی، ص ۱۴۴

۲۲۔ _____ ایضاً _____ ص ۱۴۵

۲۳۔ میر گل خان نصیر، بلوچی عشقیہ شاعری، کوئٹہ، بلوچی اکیڈمی ۱۹۷۹ء

ص۲۳۴

۲۴۔ میر گل خان نصیر، بلوچی عشقیہ شاعری، ص۲۳۵

۲۵۔ _____ ایضاً _____ ص۲۱۷

۲۶۔ _____ ایضا _____ ص۲۸۰، ۲۸۱

۲۷۔ _____ ایضاً _____ ص۲۱۹

۲۸۔ میر گل خان نصیر، بلوچی عشقیہ شاعری، کوئٹہ، بلوچی اکیڈمی ۱۹۷۹ء ص۱۴۰

۲۹۔ میر گل خان نصیر، بلوچی رزمیہ شاعری، کوئٹہ، بلوچی اکیڈمی ۱۹۷۹ء ص۲۶

۳۰۔ میر گل خان نصیر، بلوچی رزمیہ شاعری، ص۱۰۹

۳۱۔ _____ ایضاً _____ ص۱۳۲

۳۲۔ بشیر احمد، للہ وگراں ناز، کوئٹہ، بلوچی اکیڈمی ۱۹۷۰ء ص۴۶

۳۳۔ بشیر احمد، للہ وگراں ناز، ص۴۷

۳۴۔ میر گل خان نصیر، بلوچستان کی کہانی شاعروں کی زبانی، کوئٹہ، بلوچی اکیڈمی ۱۹۷۶ء ص۲۰۷

۳۵۔ کامل القادری، بلوچی ادب کا مطالعہ، کوئٹہ، بولان بک کارپوریشن ۱۹۷۶ء ص۱۰۰

۳۶۔ صبا شتیاری، گل کاروء چکن کار، کراچی، بہار گاہ پبلی کیشنز ۱۹۹۰ع

ص۲۳۳_۲۳۴

۳۷۔ میر گل خان نصیر بلوچی رزمیہ شاعری، کوئٹہ، بلوچی اکیڈمی ۱۹۷۹ء ص۲۵۳

۳۸۔ میر گل خان نصیر بلوچی رزمیہ شاعری، ص۲۵۳،، ۲۵۴

جدید بلوچی شاعری کی ابتدا اور سیاسی، سماجی و معاشرتی عوامل واثرات

جدید بلوچی شاعری کی ابتدا:

جدید بلوچی ادب کی بنیاد اور ترقی و ترویج کا عہد قیام پاکستان سے چند سال پہلے کا وہ زمانہ ہے۔ جہاں سیاسی آزادی کی تحریکات کے زیر اثر پورے ہندوستان میں انگریز استعماریت کے خلاف زبردست جدوجہد ہو رہی تھی۔ انہی تحریکوں کے اثرات نے بلوچستان کے عوام میں ایک بے چینی اور اضطراب کی کیفیت پیدا کی۔

گوکہ بلوچ عوام بلوچستان میں انگریزوں کی مداخلت کے شروع دن سے ہی یعنی ۱۸۳۹ء سے لے کر ۱۹۲۰ء تک پورے ۸۰ سال انگریزی جارحیت کے خلاف سینہ سپر رہے اور انہوں نے قدم قدم پر برطانوی افواج کا مقابلہ کیا۔ اور اپنی سرزمین پر انگریز استعمار کو کبھی چین سے دم لینے نہ دیا۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ برطانوی استعمار اپنی فوجی طاقت کے ذریعے بلوچوں کو زیر کرنے اور بلوچستان پر قبضہ اور غلبہ حاصل کرنے میں مکمل طور پر ناکام رہے۔ اس لیے براہ راست فوجی محاذ آرائی سے گریز کرتے ہوئے انہوں نے ''لڑاؤ اور حکومت کرو'' کی پالیسی پر عمل کیا۔ اس طرح وہ بلوچستان کے مختلف قبائل اور خان کے درمیان اختلاف اور نفاق کی بیج ڈال کر بلوچستان پر اپنی گرفت مضبوط کرنے میں کامیاب رہا۔

گوکہ بلوچوں نے اپنی آزادی اور قومی تشخص کی بقا کی خاطر مختلف قبائلی

ٹکڑیوں کی صورت میں قدم قدم پر انگریزی فوج کا مقابلہ بڑی بے جگری سے کیا ۔لیکن ایک عظیم اور جدید آلات ضرب وحرب سے لیس طاقت کے مقابلے میں صرف تلواروں اور دیسی ساخت کے ہتھیاروں سے کامیابی حاصل کرنا ناممکن بات تھی اور دوسری طرف بلوچ حریت پسندوں کا مقابلہ صرف انگریزی استعمار سے نہ تھا بلکہ اپنے ہی صفوں کے اندر ان قومی غداروں اور وطن فروشوں سے بھی تھا۔ جو برطانوی طاقت اور اس کی دھن دولت کے آگے سجدہ ریز ہو چکے تھے۔

بلوچستان پر اپنی مکمل گرفت اور قبضہ کے بعد ''برطانوی حکمرانوں نے بلوچستان میں سوائے حکمرانی کے عوام کی معاشی ،سماجی اور ثقافتی ترقی کے لیے کوئی خاطر خواہ کوشش نہیں کی ، نہ ہی ان کو یہاں کے عوام سے دلچسپی تھی۔ بلوچستان میں جو کچھ انہوں نے کیا۔اس کا مقصد صرف اور صرف ہندوستان کی ان سرحدوں کو مضبوط بنانے کے لیے کیا۔ جو برطانوی سلطنت اور زار روس کے مابین افغانستان کی بفر ریا ست کے مابین تھی۔ نہ ہی یہاں تجارت کو ترقی دی گئی۔اس طرح بلوچستان کی سماجی ترقی کی رفتار برطانوی دور حکومت میں نہ ہونے کے برابر تھی۔''(۱)

دوسری طرف برطانوی دور حکومت میں بلوچستان کے بالائی طبقے کو بہت زیادہ مراعات حاصل تھیں ۔بلوچ سرداروں کی اکثریت نے برطانوی حکومت کے ساتھ بڑھ چڑھ کے تعاون کیا۔ ''دراصل بلوچ سماج میں قبائلی طرز فکر اور حالات نے سرداریت کو مستحکم اور مقبول بنا دیا تھا۔سردار نے رفتہ رفتہ ہر لحاظ سے اپنے آپ کو قبیلہ کا اقتدار اعلیٰ تسلیم کرالیا تھا۔سردار جو چاہتا کرتا۔جس طرح برٹش حکومت کے استحکام

میں سردار ممد ثابت ہوا تھا۔ اس طرح برٹش حکومت نے بھی سرداروں کو مستحکم ہونے میں ان کی مدد کی۔ قبائلی ڈھانچہ سے برطانوی حکومت نے بڑی خوبصورتی سے استفادہ کیا۔ سرداروں کا جرگہ جو دراصل قبائلی نظام میں عدالتی فیصلے کرتا، ہر آڑے حکومت کے کام آتا۔ بغاوتوں کو کچلنے میں سرداورں کا جرگہ ہمہ وقت تیار رہتا۔ فرنٹیر کرائمنز ریگولیشن نے جو کالے قانون کے نام سے بدنام ہوا، وہ ہتھیار تھا۔ جس سے سیاست کا گلہ گھونٹا جاتا تھا۔''(۲)

اس عہد میں سر شمس شاہ ریاست قلات کے والئی میر محمود خان کا وزیر اعظم تھا۔ خان برائے نام تھا۔ سر شمس شاہ ہر اعتبار سے برطانوی مفادات کا خیال رکھتا۔ اور وہ حقیقی معنوں میں ریاست کا اصل حکمران تھا۔ ''نواب قیصر خان مگسی کے ساتھ اس کے اختلافات تھے۔ جس کی وجہ سے مگسی نواب نے ریاست قلات کو چھوڑ دیا۔ اور ملتان منتقل ہوگیا۔ وہاں اس کے نوجوان اور ذہین فرزند یوسف علی خان نے تعلیم پائی اور برصغیر کی سیاست نے اسے متاثر کیا۔ چنانچہ اس نے ریاست قلات کی زبوں حالی پر قلم اٹھایا۔''(۳)

۱۷ نومبر ۱۹۲۸ء کو لاہور کے ایک اخبار ''ہمدرد'' میں ریاستی قلات کے مظالم کے خلاف ''فریاد بلوچستان'' کے عنوان سے ایک مضمون لکھنے اور ۱۹۳۱ء میں قلات کے وزیر اعظم سر شمس شاہ کے خلاف ''شمس گردی'' کے نام سے ایک پمفلٹ نکالنے کے پاداش میں انہیں ایک سال کے لئے مستونگ جیل میں قید کیا گیا۔

''اسی طرح میر عبدالعزیز کرد، عبدالصمد اچکزی وغیرہ بھی برصغیر کی سیاسی

تحریکوں سے متاثر تھے۔ بلوچستان میں ان سیاسی رہنماؤں نے نوجوانوں میں سیاسی سرگرمیوں کی ابتداء کی جس سے برطانوی راج اور ریاستی نظام کے خلاف تحریکیں شروع ہوئیں''۔(۴)

بلوچستان کے عوام میں اتحاد و اتفاق اور قومی یک جہتی پیدا کرنے کی خاطر سب سے پہلے ۱۹۲۱ء میں ''انجمن اتحاد بلوچستان'' کے نام سے ایک تنظیم عمل میں لائی گئی۔(۵) اس تنظیم کے قیام میں ''اگرچہ سیاسی مقاصد بھی کارفرما تھے۔ لیکن بنیادی طور پر وہ ایک سیاسی جماعت کی بجائے ایک سماجی تنظیم تھی۔ اس تنظیم کا اولین مقصد بلوچستان کے عوام کو ایک پلیٹ فارم پر یک جا کرنا تھا''۔(۶)

''انجمن اتحاد بلوچستان'' ایک زیر زمین تنظیم تھی۔ اس تنظیم کے تشکیل میں میر عبدالعزیز کرد، میر گل خان نصیر اور ان کے دیگر رفقا نے نمایاں کردار ادا کیا۔ انجمن کے رہنماؤں نے مستونگ جیل ہی میں میر یوسف عزیز مگسی سے رابطہ کیا۔ اور جیل سے رہائی کے بعد جولائی ۱۹۳۱ء کو میر یوسف عزیز مگسی نے اس تنظیم کو ایک باقاعدہ جماعت کی حیثیت دیدی۔ اور اس کو فعال بنانے میں بنیادی کردار ادا کیا۔

''انجمن اتحاد بلوچستان'' کے روز افزوں وسیع سرگرمیوں کے باعث انگریزی حکومت ناخوش ہوئی۔ اور اس نے انجمن سے تعلق رکھنے والے سیاسی کارکنوں کو قید و بند کی سزائیں دیں۔ اسی دوران میر یوسف عزیز مگسی انگلینڈ چلے گئے۔ انگلینڈ سے واپسی کے بعد وہ کوئٹہ کے مئی ۱۹۳۵ء کے زلزے میں وفات پا گئے۔ اور ان کی وفات کے ساتھ ہی انجمن اتحاد بلوچستان کسی رسمی اعلان کے بغیر ہی

ختم ہوئی۔

انجمن اتحاد بلوچستان کی سرگرمیوں کے خاتمے کے بعد کچھ عرصہ تک خاموشی رہی۔ لیکن ۵ فروری ۱۹۳۷ء کو ''قلات اسٹیٹ نیشنل پارٹی'' کے نام سے ایک نئی سیاسی جماعت بنائی گئی۔ ''قلات اسٹیٹ نیشنل پارٹی'' کا نظریہ یہ تھا کہ بلوچستان جو ریاست قلات کا اصل نام ہے۔ ایران اور افغانستان کی طرح ہندوستان سے علیحدہ ایک مملکت اور ایک خالص اور مربوط قوم بلوچ کا آبائی وطن ہے۔ انگریزوں کا مفتوحہ ملک نہیں بلکہ دوستانہ اور مساویانہ حیثیت کے معاہدات کے ذریعے حکومت برطانیہ کے اقتدار اعلیٰ سے وابستہ ہے۔ اس لئے ہماری جدوجہد آزادی کی بنیادیں اپنی مرکزی اور قومی حکومت (قلات) اور اپنے قومی حکمران (خان قلات) سے مکمل تعاون پر رکھی جانی چاہیں''۔(۷) یعنی قلات اسٹیٹ نیشنل پارٹی کا بنیادی مقصد انگریزوں کی غلامی سے مکمل نجات، ریاست قلات کی بحالی اور خودمختیاری تھی۔(۸)

قلات اسٹیٹ نیشنل پارٹی نے جہاں ایک طرف بلوچستان میں سیاسی اور سماجی شعور پیدا کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ وہیں پہ دوسری طرف جدید بلوچی ادب کی بنیاد رکھنے میں نہ صرف اس کا کردار بنیادی اہمیت کا حامل رہا بلکہ فکری اور نظریاتی طور پر جدید بلوچی ادب اس تحریک سے اپنا مواد حاصل کرتی رہی۔ قلات اسٹیٹ نیشنل پارٹی صحیح معنوں میں برطانوی حکومت کے خلاف بلوچوں کی اولین قومی اور سیاسی تحریک تھی۔ اور اس کی سیاسی قیادت اپنے نظریات کے اثر ونفوذ کے لئے پریس کی اہمیت وافادیت سمیت سماج میں ادب کے رول اور کردار سے بخوبی آگاہ تھی۔

اس لئے انہوں نے شعوری طور پر بلوچ قومی تحریک کے پہلو بہ پہلو مستقبل کے لئے ایک متوازی ادبی تحریک کی بنیاد ڈالنے میں راہ ہموار کی۔

''کیونکہ قوم پرست نوجوانوں کو جہاں ایک طرف بلوچ عوام کی پس ماندگی اور بدحالی کا احساس ہوا تو دوسری طرف انہیں بلوچی زبان وادب اور قومی روایات و اقدار اور تہذیبی وثقافتی بے مائیگی کا فکر دامن گیر ہوا۔ اس لئے ان کی سب سے بڑی کوشش یہ رہی کہ ایک تو بلوچ عوام میں ان کی قومی وجود اور ان کے تشخص اور پہچان کا احساس اجاگر کیا جائے اور دوسری طرف بلوچ زبان وادب کو زبوں حالی سے بچایا جائے''۔(۹)

اس سلسلے میں سب سے پہلے میر گل خان نصیر نے میر یوسف عزیز مگسی کے نقش قدم پر چلتے ہوئے پہلے اردو میں شاعری کی تھی۔ کیونکہ بلوچ عوام میں تاریخی شعور اور قومی جذبہ وولولہ پیدا کرنے اور اپنی سیاسی سرگرمیوں کو بڑھاوا دینے کی خاطر میر یوسف عزیز مگسی نے نہ صرف اردو شاعری کو اپنے اظہار کا وسیلہ بنالیا بلکہ علامہ محمد اقبال' مولانا ظفر علی خان اور دوسرے شعراء اور سیاسی اکابرین سے گہرے تعلق اور روابط کی بنا پر انہوں نے جدید افکار وخیالات کو بلوچستان میں متعارف کروایا۔

میر گل خان نصیر' میر یوسف عزیز مگسی سے متاثر ہونے کے ساتھ ساتھ مولانا الطاف حسین حالی' مولانا ظفر علی خان اور سب سے بڑھ کر علامہ محمد اقبال کی اصلاحی اور ملی شاعری سے بھی متاثر تھے اور میر گل خان نصیر نے اس کا اعتراف بھی کیا تھا''۔(۱۰)

لیکن ۱۹۴۵ء میں میر گل خان نصیر نے اردو شاعری کو چھوڑ چھاڑ کر بلوچستان

کے عوام کی زبان بلوچی ہی میں شاعری کرنے کا فیصلہ کیا۔ کیونکہ بلوچستان جیسے وسیع و عریض خطے میں ایک طرف تعلیم کا فقدان اور دوسری طرف رسل و رسائل کے ذرائع نہ ہونے کے باعث تحریر و تقریر سے کہیں زیادہ موثر اور کارآمد ذریعہ و وسیلہ صرف شاعری ہی تھی جو ان کی نظریات اور سوچ و فکر کو ایک جگہ سے دوسری جگہ بڑی آسانی اور شتابی کے ساتھ پہنچا سکتی تھی۔ اس طرح میر گل خان نصیر کی شاعری مقبول ہوئی۔

میر گل خان نصیر کی اس پذیرائی کے باعث بلوچ قومی تحریک کے ایک اور اہم رہنما میر محمد حسین عنقا نے بھی اردو اور فارسی شاعری کو خیر باد کہہ کر بلوچی میں شاعری شروع کی۔ اس طرح قیام پاکستان تک قلات اسٹیٹ نیشنل پارٹی کے یہ اہم سیاسی رہنما اپنی سیاسی سرگرمیوں کو بڑھاوا دینے کی خاطر پہلے اردو اور بعد میں بلوچی شاعری کو نہ صرف ایک موثر اور کارآمد ہتھیار کے طور پر استعمال کرتے رہے بلکہ اظہار بیان کے لئے وہ نت نئے سانچے اور زاویے بھی متعارف کرتے رہے۔

''قیام پاکستان کے وقت بلوچستان برٹش بلوچستان' ایجنسیوں کے علاقے اور ریاستی بلوچستان پر مشتمل تھی۔ ریاست قلات کے سربراہ میر احمد یار خان تھے۔ الحاق پاکستان کے حوالے سے ''خان قلات چند تحفظات و مراعات کے ساتھ الحاق کے حامی تھے۔ لیکن پاکستان کی حکومت کی جانب سے غیر مشروط الحاق پر اصرار کیا جارہا تھا''۔(۱۱)

بالآخر ۲۷ مارچ ۱۹۴۸ء کو خان قلات نے پاکستان کے ساتھ غیر مشروط طور پر الحاق کا اعلان کر دیا۔ ''لیکن دباؤ کے تحت یہ الحاق خوشگوار نتائج کا باعث نہ بن سکا۔

نہ بلوچ آزادیوں کی خوشیوں میں حصہ دار بن سکے نہ ہی پاکستانی حکمران بلوچستان کو پاکستان کا حصہ بن جانے کے باوجود بلوچوں کے لئے نرم گوشہ پیدا کر سکے"۔(۱۲)

پاکستان کے بننے کے بعد "سب سے بڑا مسئلہ جس کا تعلق صوبہ بلوچستان سے تھا۔ وہ ریاستوں کا مسئلہ تھا۔ خان قلات نے اپنی ریاستی حیثیت کو برصغیر کی دیگر ریاستوں سے مختلف سمجھ کر پاکستان سے الحاق نہیں کیا۔ اس کے نتیجے میں حکومت نے مکران کے نواب بائی خان کی علیحدہ حیثیت تسلیم کر کے اسے علیحدہ کر دیا۔

مکران کے گورنر شہزادہ عبدالکریم خان نے جو خان قلات کے بھائی تھے ۔حکومت پاکستان کے اس عمل کے خلاف بغاوت کی بعد ازاں خان قلات نے بہ امر مجبوری الحاق کر دیا۔ مگر اس کے دورس سیاسی اثرات مرتب ہوئے ۔ ملک کے عوام نے انگریزوں کے نو آبادیاتی نظام سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیئے نئی حکومت سے بڑی توقعات وابستہ کی تھیں۔ اس طرح بلوچستان کے عوام اور دانشور طبقہ نے امیدیں لگا رکھی تھیں کہ آزادی کے بعد ترقی کے ساتھ ساتھ ہر طرح کی سیاسی' سماجی اور اقتصادی جبر کا خاتمہ ہوگا۔ مگر یہ توقعات پوری نہ ہوئیں۔ اس کا نوجوان اور دانشور طبقہ پر بہت سخت ردعمل ہوا۔ جب انہوں نے دیکھا کہ اس طرح نواب' سردار اور شاہی جرگہ کے اراکین عوام پر مسلط ہیں۔

بلوچستان میں جرگہ اور ایف ۔سی ۔آر کے کالے قوانین رائج ہیں۔ تعلیم میں پس ماندگی بدستور رہے۔ اور سیاسی پابندیاں پہلے سے بھی زیادہ ہیں۔ تو ان میں محرومی کے احساس نے جنم لیا۔ انہی حالات میں اور ہمارے معاشرے کی انہی

بنیادوں پر جدید بلوچی ادب کی بنیاد پڑی''(۱۳)

اور حقیقت بھی یہی ہے کہ جدید بلوچی ادب کی بنیاد میں معاشی اور معاشرتی دباؤ ' سیاسی جبریت' سماجی گھٹن اور سماجی سطح پر تلخیوں اور محرومیوں کا وہ اینٹ گارا شامل ہے۔ جس پر اس کی فکری عمارت استوار نظر آتی ہے۔ یا دوسرے لفظوں میں یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ بلوچی زبان وادب بلوچستان کی معاشی ومعاشرتی زندگی اور ذہنی وفکری ارتقاء کا وہ آئینہ ہے۔ جس میں ہر گذرتے لمحے کا عکس نمایاں ہے۔

آزادی کے پہلے انگریزی استعمار کی غلامی کا طوق اور قبائلی دیوتاؤں 'سرداروں اور نوابوں کی پر پیچ دستار بلوچ عوام کے گلے میں پھندا بن کر نظر آتا ہے۔ اور آزادی کے بعد صورت حال اس سے کہیں زیادہ گھمبیر اور بھیانک دکھائی دیتا ہے۔

قیام پاکستان کے بعد دوسرے پاکستانی عوام کی طرح بلوچ عوام نے بھی یہی سمجھ رکھا تھا کہ آزادی کی نعمت کے بعد اب غلامی 'غربت' جہالت اور پس ماندگی و درماندگی کی طویل سیاہ رات اپنی تمام تر بربریت کے ساتھ ہمیشہ ہمیشہ کیلئے دفن ہو کر رہے گی اور اس کی جگہ ایک نئی روشن صبح اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہوگی۔ اور ہر طرف خوشحالی 'امن و انصاف کا دور دورہ ہو گا۔ جاگیرداروں 'لٹیروں' سرمایہ داروں سرداروں' نوابوں اور خانوں کی حاکمیت کی بجائے جمہور کی حکمرانی ہوگی۔ کسی پر کوئی ظلم وزیادتی نہیں ہوگا۔ کسی کے ساتھ ناانصافی اور امتیازی سلوک وبرتاؤ نہیں ہوگی۔ جبر واستبداد کی زنجیریں ٹوٹ کر رہیں گی۔ مقتل وزنداں اور دار ورسن کی باتیں قصہ پارینہ بن کر رہ جائیں گی۔ اور یہاں ایک اسلامی فلاحی

اور روشن خیال جمہوری ریاست قائم ہوگی۔ جہاں آقا و بندہ، کسان و جاگیردار، مزدور اور سرمایہ دار اور چھوٹے اور بڑے کا فرق مٹ کر رہے گا۔

بھوک، مفلسی، بے روزگاری اور جہالت کی بجائے ہر ایک کو وہ وقت کی روٹی ملے گی۔ سر چھپانے کیلئے گھر ملے گا۔ انسانیت اور انسانی قدروں کو بڑھاوا اور تقویت ملے گی۔ باہمی احترام و اعتماد کا جذبہ پروان چڑھے گا۔ عدل کی زنجیر کو ہلانے سے پہلے انصاف عوام کی دہلیز پر دستک دے گا۔ لیکن پاکستانی عوام کی یہ توقعات و خواہشات ان کی امنگیں اور آرزوئیں بارآور ثابت نہ ہو سکیں۔

جس روشن اور تابناک صبح کی خاطر عوام نے امیدوں کی شمعیں جلائی تھیں۔ وہ نہ صرف سراب ثابت ہوئیں بلکہ وقت کے گذرنے کے ساتھ ساتھ ناانصافی، غربت اور جہالت کے سائے مزید گہرے ہوتے گئے۔ جمہوریت اور امن و انصاف کی بھیک مانگنے والوں کو پس زنداں کیا جانے لگا۔ سچ بولنے والوں اور خرد افروز زبانوں پر چپ کی مہر لگانے کی کوشش کی گئیں۔

قیام پاکستان سے لیکر ۱۹۸۸ء تک کی مجموعی صورتحال کے بارے میں ڈاکٹر رشید امجد لکھتے ہیں۔ کہ "آزادی کے بعد خوابوں اور آدرشوں کو تعبیر نہ ملی۔ سماجی بے انصافی اور طبقاتی جبر کا دور نہ صرف جاری رہا۔ بلکہ قیام پاکستان کے بعد اس میں مسلسل اضافہ ہی ہوتا چلا گیا۔ قیام پاکستان سے ۱۹۵۸ء کے مارشل لاء تک اور ۱۹۵۸ء سے ۱۹۶۸ء تک کی عوامی تحریک، پھر ۱۹۷۷ء کے مارشل لاء اور پھر ۱۹۸۸ء میں اسمبلیوں کی برطرفی تک آمریت اور جبر و استبداد کی وہی ڈرامہ مختلف شکلوں اور

کردار کے توسط سے کھیلا جاتا رہا۔(۱۴)

پاکستان کے دوسرے غریب، مظلوم اور مجبور، کچلے اور پسے ہوئے عوام سے نسبتاً کہیں زیادہ اس مشکل صورتحال سے بلوچستان کے عوام کو دوچار ہونا پڑا۔ بلوچ عوام کی نقطہ نگاہ، ان کی ناراضگی اور عدم اطمینانی کے اسباب کو سنے، سمجھے اور جانے بغیر مارشلائی اور عوامی ہر دونوں ادوار میں یکساں طور پر انہیں معتوب اور مطعون کیا گیا۔ نازیبا القابات سے نواز کر ان پر تشدد اور جبر کا جواز پیدا کیا گیا۔

حالانکہ پاکستان کے قیام اور الحاق کے بعد بلوچ عوام نے کھلے دل و دماغ کے ساتھ پاکستان کو ایک حسین آدرش کے طور پر اپنا ملک تصور کر لیا۔ لیکن اسے بلوچستان کے عوام کی بدقسمتی کہا جائے، یا تاریخ کی ستم ظریفی کا نام دیا جائے کہ قیام پاکستان کے چند ہی سالوں بعد ۱۹۵۵ء میں ملک میں ون یونٹ نافذ کیا گیا۔ ''ون یونٹ کے قیام نے پاکستان بھر میں چھوٹی قومیتوں میں اس کے خلاف نفرت کی آگ بھڑکا دی۔ ان میں قومی شعور کو بیدار کیا۔ اور احساس محرومی کو بڑھا دیا۔ بلوچستان میں پہلے ہی پس ماندگی تھی۔ اس کی وجہ سے یہ احساس بہت شدید تھا۔ چنانچہ اس کا خمیازہ پنجاب عوام کو بھگتنا پڑا۔ اس نفرت کا نشانہ صوبہ پنجاب کو بننا پڑا۔

مغربی پاکستان کی نوکر شاہی، جاگیردار اور سرمایہ داروں نے، جن میں پنجابیوں کی اکثریت تھی، اپنے استحصال کو تحفظ دینے کے لیے جو طریق کار وضع کیا۔ اس نے پاکستان بھر میں انتشار پیدا کیا۔ اس طرح ملک میں قومی منافرت، غیر وابستگی اور افتراق کو ہوا دی گئی۔ اور ترقی کی طرف جو قدم آگے بڑھ رہا تھا۔ اس

کی رفتار سست ہوگئی۔ اس غیر دانشمندانہ عمل کے خلاف دانشوروں' جمہوریت پسندوں اور ترقی پسند قوتوں نے جدوجہد شروع کی تو مغاد پرست برسراقتدار قوتوں نے ابلاغ عامہ کے وسیلے سے انہیں نازیبا الزامات دے کر انہیں کچلنے کی کوشش کی اور انہیں جیلوں میں بند کر دیا۔

اس طرح ہمارے سماج میں جبر وتشدد کی فضا پیدا ہوئی۔ اس تمام سماجی صورتحال کا عکس ہمارے ادب پر پڑا۔ بلوچی ادب اس سے مبرا نہ تھا۔ اس دور کے ادب میں اس جبر وتشدد کے خلاف پرزور ردعمل ہوا۔ ون یونٹ کے خلاف شدید نفرت کا اظہار کیا گیا۔ جاگیرداری' سرمایہ داری' نوکر شاہی اور ان قوتوں کی سرپرستی کرنے والوں کو بلوچی شاعری میں بالخصوص بہت تند وتیز لہجے میں مطعون قرار دیا گیا ہے۔ بلوچی کی شاعری اس قسم کی ناانصافیوں کے خلاف احتجاج کی صورت میں مزید ابھر کر سامنے آئی''۔(۱۵)

ون یونٹ کے بعد اکتوبر ۱۹۵۸ء کو ملک میں مارشل لاء لگا دیا گیا۔ اور مارشل لاء سے ایک دن قبل ۱۶ اکتوبر ۱۹۵۸ء کو قلات پر چڑھائی کی گئی۔ چند لوگ مارے گئے۔ خان قلات میر احمد یار خان کو گرفتار کیا گیا۔

خان قلات میر احمد یار خان اپنی کتاب ''قوم بلوچ اور خوانین بلوچ'' میں اس واقعہ کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ''اس باب کا آغاز ۱۶ اکتوبر ۱۹۵۸ء کی ایک خون آشام صبح کو ہوتا ہے۔ جب اذان کی روح پرور گونج خدا پرست پاکستانی بلوچوں سے لبیک وصول کر رہی تھی کہ ٹینکوں' بکتر بند گاڑیوں اور چنگھاڑتے مٹیالی

رنگت کے ترکوں کی حشر سامان گڑگڑاہٹ نے ناگاہ سجدہ عبودیت کے لئے تیاری کرنے والوں کو اپنی طرف متوجہ کرلیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے قلات شہر کو تین اطراف سے گھیرے میں لے لیا۔

نیند سے بیدار ہوتے ہی سادہ لوح بلوچوں نے دیکھا کہ قلات سے کوئٹہ ائیر پورٹ تک ۹۴ میل طویل سڑک پر فوج ہی فوج ایستادہ ہے۔ قلات کی نواحی پہاڑیوں اور شہر میں جگہ جگہ بڑے دبانے کی توپیں نصب تھیں۔ لوگ حیرت واستعجاب میں غرق سرگوشیوں میں ایک دوسرے سے پوچھتے تھے کہ یہ عظیم لشکر یہاں اچانک کیسے وارد ہوا۔ کہیں ۱۳ نومبر ۱۸۳۹ء کی یاد تو تازہ نہیں کی جارہی مگر کیونکر؟ اس روز تو میر محراب خان شہید پر انگریزی سپاہ نے شب خون مارا تھا۔ مگر آج تو انگریز نہیں ہے۔ یہ فوج تو پاکستانی ہے۔ یہ شہر بھی پاکستانی ہے۔ اور اس کا شہریار بھی پاکستانی ہے۔ پھر یہ ہولناک منظر کیوں؟

قلات نصیری کے باشندے کچھ بھی نہ سمجھ پائے کہ توپ کے ایک گولے نے انہیں ہلا کر رکھ دیا۔ شاہی مسجد کے مینار پر گولے برسائے جارہے تھے۔ اس مینار پر قلات بلوچی یونین کا سبز وسرخ پرچم لہرا رہا تھا۔ جس پر اللہ اکبر، کلمہ طیبہ اور آیات قرآنی تحریر تھیں۔ مسجد کے مینار اور مقدس پرچم کی توہین' کلائیو' کوئی ولنگٹن یا لوڈے نہیں کرا رہا تھا۔ مملکت خداداد پاکستان (جس کے بنانے میں بلوچوں نے برصغیر کے تمام مسلمانوں سے زیادہ حصہ لیا تھا) کا صدر سکندر مرزا کر رہا تھا۔ اس عالم دار وگیر میں، میں اس کمرہ سے باہر نکلا کہ جہاں مملکت پاکستان کا بانی قائداعظم طویل قیام کرتا

تھا۔ اور جو میرے ساتھ گھنٹوں تبادلہ خیال کرتا تھا۔ اسی قائداعظم کی فوج دیواریں پھاند کر قلعے میں داخل ہو چکی تھی۔ اور گولیوں کی بارش میں قلات بلوچی کے چھ معصوم شہری خاک وخون میں تڑپ رہے تھے''۔(۱۶)

پروفیسر عزیز محمد بگٹی اس واقعہ کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ کہ ''میر احمد یار خان مرحوم واقعات کو بیان کرتے وقت کچھ جذباتی ضرور محسوس ہوتے ہیں۔ لیکن واقعات کی حقیقت بہر حال یہی تھی اور یہ سب کچھ اس شخص اور اس کی ریاست کے ساتھ کیا گیا۔ جس کے بارے میں خود قائداعظم کے یہ الفاظ ریکارڈ پر ہیں کہ ''خان! اگر آپ میری مدد نہ کرتے تو پاکستان قائم نہ ہوتا''۔(۱۷)

اس افسوس ناک واقعہ کے بعد ملک میں مارشل لاء لگایا گیا۔ پاکستان کے دوسرے صوبوں کی طرح بلوچستان میں بھی مارشل لاء کے خلاف مزاحمتی تحریک شروع ہوئی۔ مزاحمتی تحریک کے نتیجے میں نواب نوروز خان اور ان کے ساتھیوں کو گرفتار کیا گیا۔ ''سات بلوچ قبائلی عمائدین کو ایوبی حکومت کی مخالفت کے جرم میں ۱۵ جولائی ۱۹۶۰ء کو سزائے موت دے دی گئی۔ ایوبی حکومت کے دور میں مزاحمتی تحریک کی وسعت میں اضافہ ہی ہوتا گیا''۔(۱۸)

مارشل لاء کے نتیجے میں بلوچستان کے سیاسی رہنماؤں سمیت بلوچ قلمکاروں، ادیبوں اور دانشوروں کو پس زنداں کیا گیا۔ جس میں بلوچستان کے نامور شاعر اور ادیب ''میر گل خان نصیر، محمد حسین عنقا اور آزات جمالدینی کے علاوہ بیشتر بلوچ ادیب اور شاعر اذیت گاہوں اور زندانوں میں بند کئے گئے''۔(۱۹)

ان مسلسل بحرانوں کے نتیجے میں ادبی المیے میں مزید شدت اور گہرائی آتی گئی۔ ردعمل کے طور پر بلوچی شاعری ایک نئی احتجاج اور مزاحمت میں ڈھلتی گئی۔ ڈاکٹر شاہ محمد مری اپنی کتاب ''بلوچ قوم قدیم عہد سے عصر حاضر تک'' میں لکھتے ہیں کہ ''قوم پرست ادب دو دھاری تلوار تھا۔ اس میں جمہوریت، سیاسی آزادی، سماجی انصاف، قومی برابری، قومی تحریک آزادی کی باتیں بھی ہوئیں۔ مگر اس سے سرداروں، فیوڈلوں کو بھی خوب تقویت ملی کہ وہی ''قومی تحریک'' کی قیادت کر رہے تھے''۔(۲۰)

ایوبی دور میں داروگیر کا یہ سلسلہ ۱۹۶۹ء تک جاری رہا۔ ون یونٹ اور مارشل لاء کے خاتمہ کے بعد بلوچستان کو پہلی بار یکم جولائی ۱۹۷۰ء کو صوبائی حیثیت ملی۔ دسمبر ۱۹۷۰ء میں عام انتخاب ہوئے۔ جس کے نتیجے میں بلوچستان میں نیشنل عوامی پارٹی اور جے۔ یو۔ آئی کی مخلوط حکومت بنی۔ نیپ اور بھٹو کے درمیان عدم مطابقت کے باعث ''جناب بھٹو نے ۱۵ فروری ۱۹۷۳ء کو سردار مینگل کی صوبائی حکومت کو برطرف کر دیا۔ جو صوبے میں چوتھی فوجی کاروائیوں کی بنیاد بنی۔ اگست ۱۹۷۳ء کو نیپ بلوچستان کی قیادت کو جیل میں ڈال دیا گیا۔ اور اس کے ساتھ ہی بلوچستان میں ظلم، تشدد، بربریت اور قتل و غارتگری کے ایسے دور کا آغاز ہوا۔ جو اس سے قبل کی جانے والی کاروائیوں کے مقابلے میں زیادہ ظالمانہ اور سنگدلانہ تھا۔''

(۲۱)

اور یہ سلسلہ جنرل ضیاء الحق کے آنے تک جاری رہا۔ ''جولائی ۱۹۷۷ء میں

جنرل ضیاء الحق برسر اقتدار آ گئے تو انہوں نے بلوچستان کے خلاف کسی قسم کی فوجی کاروائی تو نہیں کی۔ البتہ وہ نفسیاتی حملوں کے ذریعے بلوچوں کی وحدت کو ختم کر کے انہیں قبائلی اور گروہی تقسیم کا شکار بنانے میں کامیاب ہو گئے''۔ (۲۲)

پروفیسر عزیز محمد بگٹی اپنی کتاب ''بلوچستان سیاسی کلچر اور قبائلی نظام'' میں قیام پاکستان سے لے کر ۱۹۷۷ء تک بلوچستان کی صورتحال کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ''برصغیر کی آزادی کے بعد یہاں قائم ہونے والی مسلم مملکت کی جانب سے بھی اولین حملے کا نشانہ بلوچستان کو ہی بننا پڑا۔ فوجی کاروائیوں اور ان کے خلاف مزاحمت کی یہ تاریخ ۱۹۴۸ء سے لے کر ۱۹۷۷ء تک کے عرصے پر محیط ہے۔ اس دوران حکمرانوں کے ساتھ ہر قسم کا تعاون کرنے والے بے شمار افراد بھی موجود تھے۔ لیکن بلوچستان کی عمومی فضا سیاسی مخالفت اور مزاحمت ہی کی رہی۔ اس چپقلش کے دوران ہتھیار اور بارود کے ساتھ ساتھ خرد و جنوں اور شعور و لاشعور کی آزمائشیں بھی ہوتی رہیں۔ مادی، اخلاقی اور نفسیاتی حملوں اور مزاحمت کے سلسلے بھی جاری رہے۔ اس دوران ملک میں کئی حکومتیں برسر اقتدار آئیں۔ لیکن بلوچستان کے بارے میں سب کی پالیسی ایک ہی رہی۔ یہ سب تاریخ کا حصہ بن چکا ہے''۔ (۲۳)

سلطان نعیم قیصرانی اس صورتحال کو ذرا مختلف نقطہ نگاہ سے دیکھتے اور پرکھتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ''تاریخی اور تہذیبی طور پر موجودہ پاکستان کی تاریخ سیاسی معاشیات کے حوالے سے طبقاتی کشمکش کی ایک ایسی تاریخ ہے۔ جس نے بلوچستان کے اندر خاص طور پر ان طبقات کا تحفظ کیا جو انگریزی استعمار کی ان باقیات میں سے

تھے۔ جنہوں نے ہمیشہ نہ صرف جمہوری عمل کو سبوتاژ کیا بلکہ جمہوری رویوں کو بھی بڑی بے رحمی سے کچل دیا۔ اس سلسلے میں فوجی اور نام نہاد جمہوری حکومتیں دونوں ہی نے بلوچستان کے عوام پر بلا تخصیص آہن و بارود کی بارش کرنا اپنی حکومتوں کو مستحکم کرنے کے لئے ضروری سمجھا۔ ان حکومتوں کی اس جرم میں یہاں کے سردار، نواب اور وڈیرہ وغیرہ تمام کے تمام برابر کے شریک ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بلوچستان کے عوام میں احساس محرومی کے ایسے رویوں نے جنم لیا۔ جس میں مرکز گریز جراثیم در آئے۔ چنانچہ اگر آج بھی کوئی بلوچستانی یہ کہتا ہے کہ ہماری ترقی کا راستہ وفاق اور پنجاب کی وجہ سے بند ہو چکا ہے تو انہیں اس لئے قصوروار نہیں ٹھہرایا جا سکتا کہ حکمرانی کا تصور پاکستان کے اندر پنجابی جاگیردار کے ساتھ اٹوٹ طور پر جڑا ہوا ہے۔ جن کے مفادات عوام کے ساتھ ٹکراتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

یہ ٹکراؤ اس عمل کا نتیجہ ہے۔ جہاں پاکستان کے بننے کے بعد عوام کو خاص طور پر بلوچستانی عوام کو تہذیب کے اثمار سے بہرہ ور ہونے کی بجائے انہیں تہذیبی عمل (معاشرتی ومعاشی) سے کوسوں دور رکھ کر انگریزوں کے پروردہ سرداروں، نوابوں، وڈیروں اور مقدموں کے ذریعے حکمرانی کرنے کی کوششیں کی جاتی رہیں۔ اور جن سرداروں، نوابوں اور خوانین وغیرہ کو حکمرانی میں حصہ دار نہ بنایا گیا۔ انہوں نے عوام کے ایک حصے کو اپنے گرد اکٹھا کر کے مختلف نعرے وضع کیئے اور انہی نعروں کو بنیاد بنا کر حکمرانوں نے بلوچستان پر کئی مرتبہ فوج کشی بھی کی۔ لیکن اس بات کا کسی نے بھی ادارک نہیں کیا کہ یہ احتجاج ان کی بقائے حیات کی ایک جدوجہد

ہے۔

صورتحال کے بارے میں نقطہ ہائے نگاہ جو بھی ہوں مگر حقیقت حال یہ ہے کہ ۱۹۴۷ء سے لے کر ۱۹۷۷ء تک کے تیس سال سیاسی اور فکری سطح پر مزاحمت، تشدد، خوف و یاس اور بیم و رجا پر محیط نظر آتے ہیں۔ جس کے باعث بلوچستان کے شاعر، ادیب اور دانشور براہ راست متاثر رہے۔ جدید بلوچی شاعری احتجاج، ردعمل اور مزاحمت سمیت اسی کرب کا اظہار ہے۔

بلوچی شاعری کی اسی کرب اور ردعمل کے حوالے سے غوث بخش صابر ''بلوچی ادب'' میں رقم طراز ہیں کہ ''سیاست کے نام لیواؤں نے سیاسی رہنماؤں، کارکنوں کو جس طرح تختہ مشق بنایا وہ ہماری تاریخ کا ایک لرزہ دینے والا باب ہے۔ پھر ناعاقبت اندیش حکمرانوں نے غلط قسم کے عناصر کی باتوں میں آکر بلوچستان میں اپنے ہی بھائیوں کو طاقت کے بل بوتے پر روندا، دار و رسن کے جیسا بازار گرم کیا، ان سب باتوں نے دلوں میں غبار بھر ڈالا۔ اس غبار کو، مایوسی کے اس ردعمل کو ناانصافیوں کے اس نتیجے کو شعروں کا روپ ملا۔ کچھ نے رمز کا سہارا لیا، کچھ نے برملا اظہار کیا، مشکل ہی سے کوئی ایک بلوچی شاعر ایسا ہوگا۔ جس نے غم جانان کو غم دوراں کے پردے میں نہ دیکھا ہو۔

اس میں کچھ بھی مبالغہ نہیں کہ وہی شعر اور وہی شاعر عوام کے دلوں کی دھڑکن بن کر رہ گئے۔ جنہوں نے شاعروں کی قید کے دوران جنم لیا۔

میر گل خان نصیر نے جتنے اشعار جیلوں اور زندانوں میں رہ کر موزوں کیئے

۔اتنے آزاد فضا میں نہیں کیے ہوں گے۔محمد حسین عنقا کی شاعری بائیس برسوں تک کراچی، ہری پور، منٹگمری، مچھ اور حیدر آباد کے جیلوں میں پل کر جوان ہوئی۔

آزات جمالدینی، اکبر بارکزئی، مراد ساحر، سید ظہور شاہ، ہر ایک نے تلخی دوراں کے ذائقے چکھے۔ یہ سارے تجربات، غم کے لمحات، زخم زخم احساسات شاعری کا سرمایہ بن کر جدید بلوچی ادب کو تحفے میں ملے۔

اس لئے جب ہم بلوچی شاعری کے دور جدید میں آغاز پر پہلی نظر ڈالتے ہیں تو معاصرین کی شاعری کے برخلاف اس میں حسن و عشق کی وارداتوں، گل و بلبل، شراب و شباب کی حکایتوں کی جگہ دل گداز نعرے اور دلدوز چیخ و پکار سنتے ہیں''۔(۲۵)

بلوچستان کی اس مجموعی صورت حال کے باعث جدید بلوچی شاعری کے موضوعاتی دائرہ میں چھ بڑی نمایاں لہریں دیکھنے میں آتی ہیں۔سب سے پہلی لہر جس نے پاکستان کے بننے سے پہلے انگریزی استعماریت کے خلاف مزاحمت کے نتیجے میں وطن دوستی اور قوم پرستی کی ایک مکمل فکری تحریک کی صورت اختیار کی تھی۔قیام پاکستان کے بعد یہ لہر نہ صرف برقرار رہی بلکہ اس میں ہر گزرتے لمحہ کے ساتھ وسعت اور شدت آتی گئی۔

قوم دوستی اور وطن دوستی کی لہر میں شدت آنے کی بڑی وجہ ملک کی وہ مجموعی صورتحال ہے۔ جہاں اس کے قیام کے وقت یہ امید بندھ چکی تھی۔ کہ اب غلامی، غربت، جہالت، لوٹ کھسوٹ اور استحصال سے نجات ملے گی۔لیکن تقسیم کے بعد جلد ہی یہ احساس ہونے لگا کہ جس مقصد کی خاطر اس ملک کو حاصل کیا گیا وہ نہ صرف پوری

ہوتی دکھائی نہیں دیتی بلکہ ظلم وستم میں کچھ زیادہ ہی اضافہ ہونے لگا ہے۔تو اس صورتحال میں مایوسی اور ناامیدی کے علاوہ وطن دوستی اور قوم دوستی کی لہر میں بھی شدت آتی گئی۔

جُبکہ دوسری طرف سیاسی اور اقتصادی محرومیوں اور خارجی دباؤ ہی کے نتیجے میں بلوچی ادب میں احتجاج اور مزاحمت کی ایک نئی اور دوسری لہر برآمد ہوئی۔جس نے بلوچی شاعری کو ایک نئی صورتحال سے دوچار کیا۔

تیسری لہر ۱۹۸۸ء کے بعد قوم پرست تحریک کے انتشار کے نتیجے میں بلوچ سیاسی رہنماؤں کے خلاف مایوسی اور بیزاری کی صورت میں نمودار ہوئی۔

آزادی کے بعد خوابوں، آرزؤں اور آدرشوں کے پورا نہ ہونے کے نتیجے میں جنم لینے والی بلوچ قوم دوستی اور وطن پرستی کی اس نئی اور پہلی لہر نے بلوچی شاعری میں دھرتی اور اس کے مظاہر سے والہانہ محبت اور شدید وابستگی کی ایک صورت پیدا کردی۔جس سے بلوچ شعراء کے ہاں کہیں بلند لہجہ اور دوٹوک انداز میں اور کہیں علامتی اور استعارتی پیرائے میں اس صورت حال کے بارے میں ایک ملا جلا اظہار ملتا ہے۔جس میں قوم دوستی اور وطن دوستی کے ساتھ ساتھ ایک احتجاج اور ردعمل بھی نمایاں ہے۔چوتھی اور پانچویں لہر بالترتیب عالمی طرز احساس اور اُمید ورجائیت جو کہ جدید بلوچی شاعری کے مستقل اور پائیدار مظہر ہیں جبکہ چھٹی اور آخری لہر بلوچستان کی سیاسی سماجی اور معاشرتی انتشار کے نتیجے میں درآنے والی وہ لہر ہے جس نے نوجوان نسل کے شعراء کو ذات کی طرف مراجعت کرنے پر مجبور کیا۔

حوالہ جات

۱۔ عبداللہ جان جمالدینی، مقالہ، پاکستان معاشرہ اور بلوچی ادب، پاکستانی معاشرہ اور ادب، کراچی، پاکستان سٹڈی سنٹر ۱۹۸۷ء ص ۱۵۳۔

۲۔ عبداللہ جان جمالدین، پاکستانی معاشرہ اور ادب، پاکستانی معاشرہ اور ادب، ص ۱۵۳

۳۔ _____ ایضاً _____ ص ۱۵۴

۴۔ _____ ایضاً _____ ص ۱۵۴، ۱۵۵

۵۔ شے رگام، شپ روچ شپ، کوئٹہ، بلوچی پبلی کیشنز ۲۰۰۰ء ص ۲۶

۶۔ پروفیسر عزیز محمد بگٹی، بلوچستان سیاسی کلچر اور قبائلی نظام، لاہور، فکشن ہاؤس ۱۹۹۵ء، ص ۱۱۰

۷۔ میر گل خان نصیر، تاریخ بلوچستان، کوئٹہ، روبی پبلشرز ۱۹۸۶ء ص ۴۴۶

۸۔ احمد سلیم، ٹوٹتی بنتی اسمبلیاں اور سول ملٹری بیوروکریسی، لاہور، جنگ پبلشرز ۱۹۹۰ء ص ۱۹۸

۹۔ غلام فاروق بلوچ، نوکین تام، کراچی، بلوچی لنبر انکی دیوان ۱۹۸۵ء ص ۴۷

۱۰۔ غوث بخش صابر، بلوچی ادب، اسلام آباد، اکادمی ادبیات پاکستان ۱۹۹۹ء ص ۱۲

۱۱۔ پروفیسر عزیز محمد بگٹی، بلوچستان سیاسی کلچر اور قبائلی نظام، لاہور، فکشن ہاؤس ۱۹۹۵ء، ص ۲۶

۱۲۔ پروفیسر عزیز محمد بگٹی، بلوچستان سیاسی کلچر اور قبائلی نظام، ص ۲۷

۱۳۔ عبداللہ جان جمالدینی، مقالہ، پاکستانی معاشرہ اور بلوچی ادب، پاکستانی معاشرہ اور ادب، کراچی، پاکستان سٹڈی سنٹر ۱۹۸۷ء

۱۴۔ رشید امجد، ڈاکٹر (مرتب) مزاحمتی ادب (اردو) اسلام آباد، اکادمی ادبیات پاکستان ۱۹۹۵ء ص ۴۵

۱۵۔ عبداللہ جان جمالدینی، مقالہ، پاکستانی معاشرہ اور بلوچی ادب، پاکستانی معاشرہ اور ادب، کراچی، پاکستان سٹڈی سنٹر ۱۹۸۷ء ص ۱۴۰، ۱۴۱

۱۶۔ میر احمد یار خان بلوچ، قوم بلوچ اور خوانین بلوچ، کراچی، انجمن پریس ۱۹۷۲ء ص ۱۷۹

۱۷۔ پروفیسر عزیز محمد بگٹی، بلوچستان سیاسی کلچر اور قبائلی نظام،، لاہور، فکشن ہاؤس ۱۹۹۵ء ص ۲۹

۱۸۔ پروفیسر عزیز محمد بگٹی، بلوچستان سیاسی کلچر اور قبائلی نظام، ص ۲۹

۱۹۔ عبداللہ جان جمالدینی، مقالہ، پاکستانی معاشرہ اور بلوچی ادب، پاکستانی معاشرہ اور ادب، کراچی، پاکستان سٹڈی سنٹر ۱۹۸۷ء ص ۱۴۱

۲۰۔ ڈاکٹر شاہ محمد مری، بلوچ قوم قدیم دور سے لے کر عصر حاضر تک، لاہور، تخلیقات، ۲۰۰۰ء ص ۳۱۸

۲۱۔ پروفیسر عزیز محمد بگٹی، بلوچستان سیاسی کلچر اور قبائلی نظام، لاہور، فکشن ہاؤس ۱۹۹۵ء ص ۳۲

۲۲۔ پروفیسر عزیز محمد بگٹی، بلوچستان سیاسی کلچر اور قبائلی نظام، ص ۴

۲۳۔ پروفیسر عزیز محمد بگٹی، بلوچستان سیاسی کلچر اور قبائلی نظام، ص ۴

۲۴۔ سلطان نعیم قیصرانی، پیش گفتار، عبداللہ جان جمالدینی، بلوچستان میں سرداری نظام، کراچی، سید ہاشمی ریفرنس لائبریری ۲۰۰۰ء ص ۲۸، ۲۹

۲۵۔ غوث بخش صابر، بلوچی ادب، اسلام آباد، اکادمی ادبیات پاکستان ۱۹۹۹ء ص ۹۵

☆☆☆☆

جدید بلوچی نظم کا فکری اِرتقاء

بلوچی نظم کا فکری ارتقاء

بلوچی شاعری کی پانچ سو سالہ ادبی تاریخ کو سامنے رکھتے ہوئے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ بلوچی کی شعری روایت نظم کی شاعری ہے، جو لوک ادب سے لے کر کلاسیکی شاعری تک اس کے خمیر میں رچی بسی نظر آتی ہے۔

غزل، قصیدہ یا دوسرے اصناف کی شاعری ایک خاص نوع کی تہذیبی ترقی اور ماحول و حالات کی پیداوار ہونے کے ناطے سے بلوچستان کے مخصوص سماج، زمین، معاشرتی نظام اور رہن سہن سے لگا نہ رکھنے کے باعث بلوچی شعری زمین اور مزاج میں اپنی جڑیں پیوست کرنے کی متحمل نہیں ہو سکتی تھیں۔ گو کہ آزادی کے بعد غزل ایک مستعار صنف سخن کی حیثیت سے بلوچی شاعری میں نہ صرف اپنی جگہ بنانے میں کامیاب نظر آتی ہے بلکہ بلوچی شعری روایت کے زیر اثر ہونے کے باعث اردو اور فارسی غزل کی مجموعی مزاج کے برعکس ایک مختلف اور منفرد رنگ و آہنگ اور ایک وسیع موضوعاتی دائرے کا مالک بھی ہے۔

غزل کے برعکس نظم شروع دن سے ہی بلوچی شعری روایت کی بنیاد اور منبع

رہی ہے۔ اور موجودہ بلوچی نظم اور نظم آزاد کلاسیکی بلوچی شعری تکنیک کے فطری ارتقاء کا مظہر ہے جو اپنی ہیئت کے اعتبار سے بہت حد تک آزاد ہیئت کی حامل ہے۔ لیکن یہ اردو کی آزاد نظم کے برعکس اوستا کے منظوم ''گاتھاؤں'' اور سنسکرت کے ''چھند'' سے مشابہت رکھتی ہے۔

''آزاد نظم کی ہیئت تمام تر موضوع کے تابع ہوتا ہے۔ شاعر کو آزادی حاصل ہوتی ہے کہ جس جگہ خیال مکمل ہو، خود کو روک لے۔ اس طرح ''خیال'' کے بہاؤ کے مطابق مصرعے ترتیب پاتے ہیں۔ اور یہ ضروری نہیں ٹھہرتا کہ مصرعوں کے ارکان پابند یا معریٰ نظم کی طرح مساوی ہوں۔ کوئی مصرعہ چھوٹا ہوتا ہے کوئی طویل .....اتنا چھوٹا کہ ایک لفظ بھی مصرعہ ہوسکتا ہے۔ اور اتنا طویل کہ وہ کئی سطروں تک پھیل سکتا ہے''۔(۱)

آزاد نظم میں قافیہ کی پابندی نہیں ہوتی۔ لیکن وزن یا بحر کی پابندی موجود ہوتی ہے۔ صرف ارکان کم یا بیش کردیئے جاتے ہیں۔ جس کے سبب بعض مصرعے چھوٹے اور بعض طویل ہوتے ہیں۔ کم و بیش یہی صورت بلوچی کلاسیکی نظم کا ہے۔ قدیم بلوچی ''نظموں میں بندوں کی کوئی پابندی نہیں۔ اور نہ ہی مصرعوں کا کوئی تعین۔ مصرعوں میں ایک قسم کا وزن ضرور ہوتا ہے۔ لیکن اس میں بھی ارکان یا ماتراؤں کی پابندی نہیں کی جاتی۔ ایک ہی بند کے کسی مصرع میں کم اور کسی میں زیادہ ماترائیں معیوب نہیں سمجھی جاتیں۔ اکثریت سے مصرعے لمبے ہوتے ہیں۔ کیونکہ بلوچی شعر گانے کے لئے ہے۔ اس لئے فقط ''لے'' یا ''الحان'' کا خیال رکھا جاتا ہے۔ بعض

نظموں میں ردیف اور قافیے کی پابندی بھی کی جاتی ہے۔

بلوچی عروض پارسیوں کی دینی کتاب ''اوستا'' کے منظوم ''گاتھاؤں'' اور سنسکرت کے ''چھند'' سے ملتا جلتا ہے۔ جو رگ وید میں مستعمل ہیں۔ سب سے قدیم شعر صرف الحان پر مبنی ہے۔ لیکن بعد میں مخصوص اضاف سخن کے لئے مخصوص بحریں مقرر کردی گئی ہیں۔ ان کا بھی اگر فنی تجزیہ کیا جائے تو ماتراؤں کے گھٹانے اور بڑھانے کا رجحان عام ملے گا''۔(۲)

گو کہ عہد حاضر میں قدیم بحور کا استعمال ترک کردیا گیا ہے۔ اور تمام تر شاعری میں وہی بحریں اور اوزان اختیار کئے جارہے ہیں۔ جو فارسی اور اردو شاعری میں مستعمل ہیں۔ اس طرح جدید بلوچی آزاد نظم کی ہیئت اردو کے آزاد نظم کے قریب تر ہے۔ جبکہ انگریزی میں آزاد نظم کا جو تصور ہے وہ بہت حد تک اردو کی نثری نظم سے قریب تر ہے۔

چاکری دور کی بلوچی شاعری میں ''اوستا'' کے گاتھاؤں اور سنسکرت کے ''چھند'' کے طرح کی نظم کے ساتھ ساتھ پابند نظم کی روایت بھی دیکھنے میں ملتی ہے۔ لیکن اٹھارہویں صدی کی بلوچی شاعری میں پابند نظم کا عمل دخل کچھ زیادہ ہی نمایاں ہے۔ جبکہ اس سے قبل سترھویں صدی میں ''ملائی دور'' کی شاعری میں قدیم بلوچی عروض کے ساتھ ساتھ عربی عروض کا استعمال بھی دیکھنے میں ملتا ہے۔(۳)

یہاں کلاسیکی بلوچی نظم کی چند مثالیں ملاحظہ کیجئے جو اپنی ہئیت کے اعتبار سے اوستا کے ''گاتھاؤں'' اور سنسکرت کے ''چھند'' سے مشابہت رکھتی ہیں۔

ے بانی ترا شاہءِ سرانت
اش ماسری ءَ جُھنڈ مخن
مارا پہ نیم چماں مہ گند
کہ دل کو تلی چیزے نہ انت
مہر پہ بہا گپت نہ بیت
(دردانغ ایں بانی ۔۔ شاہ مرید) (۴)

☆

ے دست ءَ جنت سیاھین گوالغ ءِ داناں
بارت اش گوردست گند ءَ جن آنی ءَ
زیت کن دست گند، گندمنی دست ءَ
گندمنی دست ءَ اود یے منا حال ءَ
کہ دیر کشہ ہوتیں حمل ای تیغاں
نئے وث ءَ کیث اونیں ماہر وے شمشتیث
نئیں دف ءَ ھمبوئیں سلام یے کیشئی ۔
(حمل ءُ شیر ۔۔۔ حمل جیند) (۵)

☆

ے تیغ نہ رنڈیث مس سیمریں جنک یے
کہ علن ءِ لوہاردا ثغیں وڈھو

دست مہ لرزیث اودل مہ چھنڈیث

یک بریں زغریری رہے ژل دینی

ماں پلاناں بندغ ءِ جاہ

گردن ءِ چوکانڈیلی بہ تریز زینی

(حمل ءِ شیر۔۔۔ حمل جئیند)(۶)

☆

کل نہ چنڈیت کہ سک نیں پیڑ دار

دف مہ کندیث در نہ نبت دنتان

مس حماں ھنجیر اں پتن تاخین

کہ تنگ تڑیں کُنمبانی سرارستاں

مس حماں جیہنیں گروءِ گٹاں

ڈکن ءِ گوات کہ ژاگورے کشیث

اسکرادر شکانی سراچنڈیث

سرمنی ھچ گوات ءَ نہ لوڑینتہ

بندمنی ھچ ھورءَ نہ میسینتہ

جنغ اوں پہ جام ایں عومرءِ بستہ

گورءَ گندیث یاعوم بوژیث

(سلام۔۔۔ منہاز)(۷)

☆

ے

پکھی نہ پرام ءِ مناں

سہر کن ءِ تہ ہوشغاں

سوری داں گنجیں مٹھڑی

درست منی سوز ءِ جواث

راجے مغسوءَ کن انت

موڑ دانغ مُدیشغاں

پہ منی کاسغانی چشغ ءَ

توڑءِ سلاہ زیراث منی

کہ دوراں بلوچ دھلیشغ انت

(نہ پرام ءِ۔۔۔میر بکر لاشاری)(۸)

☆

ے

گوخاں تیغ زنیں ہمی ءِ

باہوٹ انت گرے دودایا

راہ منت ننگریں ورنائے

گوخ اش زیشغ انت ہمی ءِ

میترل پوتر واں جمشین انت

ناحق اے پدار نجینت انت

ڈاھے آڑتفا گوالاں

دوداو پتغ ءِ وہاو بثغ

ماث ءِ پادکتہ یمین ءِ

نہہ ماہ اوں ترالاف اوں کت

ئے سال اوتر اوں میشینتہ

تہ گوخاں گوں کن نے گوالاں

آ کہ چورووث سیاد پاذے

نیں ھمے گوخاں سرجی ءِ بیارے

یا وثی بیسی چونوءِ زیاں دارئے۔

(باہوٹ)(۹)

☆

ژامڑاں استین یے سراکشیت

برز چوماران ءِ کمیں کوہاں

کہکر شہ نتھاءِ سراپاغ انت

جیبرتی ھنمبو نیں گلالک انت

ترمپ تی مورتیں جابہ ءِ تیرانت

شف گروخ میان ءِ گانہوریں تیغ انت

گرند چونتھا تو یک ءِ گوانک انت

اوتا نہی نوذاں گوں شا عرض انت

کہ آں شہیدانی زیارتاں مین ات

یہ دم یے مونگا نزو کن ئے تر میاں

شماز باد بوئیں جیبر اں بل ات

اش ءَ سمینانی گلگل وھلاں

در کفیث سالونک در وشمیں نتھا۔

(ارس۔۔۔سیمک)(۱۰)

☆

ہانی منا تیراں مہ جن

شلی نہاں ماں ڈو برءَ

پہ ھمے رنگا ساہ اوں نے روت

ژاموژیں دل ءَ نہ انت رضا

زیرتہ وتی جود ءِ بُنغ ءَ

براخ ءِ دو گوشیں خنجرا

بلی مرید ءَ ماں کش ءَ

داں بردوئیں کش ءَ پار ءَ گذیث

ہونی پہ ھلکہاں اریر شنت

پاک اش کن ئے گوں شار ءِ پلوا

(دردانغیں ہانی۔۔۔شاہ مرید)(۱۱)

☆

زی منا میریں جاکرۓ گوشتہ
شمبری سودایاں ترا سیت انت
مس جن یے سیاہ مار چوٹویں دیسہ
ھندماں میری پتمی محل انت
چومن ایں مرد پہ گندغا شات انت
چوروءِ بیر مرداش دل اتخیم انت
من دہ پہ نیموں یے رواں شہرءَ
سرمنی کپتہ حاکمی قیداں
بادشاہانی تاڑءِ تیلا لکاں
مس مغل کوٹھی بستغین مڑداں
شف پرے دوروخان میاث ئے
روش پرے باندی بستغین مڑداں
(گراں ناز۔۔۔میر بیورگ)(۱۲)

☆

کوہ انت بلوچانی کلات
آشہ بادگیراں گہہ انت

برزیں حشی ، ہمسائیگنت

ہمراوے راہیں گرانت

آف ، بہوخیں چمگ انت

کوڑی پچشیں کنڈل انت

نشتگیں جنی کرکاوغ انت

بوف ڈغاری تجغت

بورمئے سُغیشیں چبوانت

منی پچ کشینی گونڈل انت

منی زامات شلیں خنجرانت

منی برات تلاہیں اسپرانت

منی عاریف مزن تاپیں لڑانت

(کوانت بلوچانی کلات۔ بالاچ گورگیج) (۱۳)

☆

من گنوخاں کہ گوں دل ءَ جھیڑاں

دل گنوخیں کہ گوں من ءَ جھیڑیت

گر یہہ کھنت تھنگو دروشمیں بچی

زور کھنت شاہ وظالمیں ترکی

ماں مڑاں زنجیر مھفراں لوٹیت

اژھاہاں کہ ماں صداں یکے

مول من گواراں دہ صدء لکھے

(من گنوخاں۔۔۔جام درک)(۱۴)

جدید بلوچی شاعری میں ہیئت اور مواد کے اعتبار سے نئی نظم کا پہلا تجربہ ھمیں میر گل خان نصیر کے ہاں ملتا ہے۔۱۹۴۶ء میں ''وہ کسی سیاسی کانفرنس میں شرکت کے لیے صوبہ سرحد گئے ہوئے تھے۔ اس کانفرنس میں انہوں نے پشتونوں کو پشتو میں تقریریں کرتے اور شعر کہتے سنا۔انہیں شدید احساس ہوا کہ ان کو بھی بلوچی میں جو عوام کی اکثریت کی زبان ہے،اس میں شعر کہنے چاہیں۔شاعر تو وہ تھا ہی۔وہیں کہیں دریا کے کنارے بیٹھ کر گل خان نے بلوچی کی اپنی سب سے پہلی نظم تخلیق کی، جوان کے پہلے مجموعے کلام ''گلبانگ''میں ''بیا او بلوچ'' کے عنوان کے تحت شائع ہوئی ہے۔''(۱۵) بعض روایتوں کے مطابق میر نصیر کی پہلی نظم ''گوک پروش'' کے شہیدوں کے بارے میں ہے، جسے انہوں نے 1940ء میں منظوم کیا۔

میر گل خان نصیر شروع میں اردو میں شاعری کرتے تھے۔اردو شاعری کے حوالے سے مولانا حالی،علامہ اقبال،غالب،جوش اور مولانا ظفر علی خان سے متاثر ہونے کے علاوہ وہ میر یوسف عزیز مگسی سے بھی متاثر نظر آتے ہیں۔کیونکہ بلوچ قوم میں تاریخی شعور اجاگر کرنے اور ان میں قومی جوش و جذبہ پیدا کرنے کی خاطر میر یوسف عزیز مگسی اپنی سیاسی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ اردو شاعری سے بھی کام لیا کرتے تھے۔

''بلوچی میں شاعری شروع کرنے سے گل خان نصیر کا جذبہ شعر گوئی بہت تیزی سے ابھرا۔ اور انہوں نے دیکھا کہ بلوچی ان کے خیالات، جذبات اور سیاسی مقاصد کے اظہار کے لیے موزوں ترین زبان ہے۔ نصیر کو بلوچی کلاسیکی شاعری کے محاسن اور کمال کا اندازہ تھا۔ انہوں نے نہایت ہی انہماک سے اس قیمتی ورثے کا مطالعہ کیا۔ اس سے گل خان کی شاعری نکھرتی گئی۔ ان کے خیالات کے اظہار میں نہایت ہی وسعت، روانی اور گہرائی پیدا ہوتی گئی۔'' (۱۶)

میر گل خان نصیر کا پہلا شعری مجموعہ ''گلبانگ'' کے نام سے ۱۹۵۱ء میں شائع ہوا، جو جدید بلوچی شاعری کا اولین شعری مجموعہ بھی ہے۔ ان کے اس شعری مجموعہ میں مولانا حالی، علامہ اقبال اور غالب کا رنگ و آہنگ بخوبی دیکھا جا سکتا ہے۔ لیکن کلاسیکی بلوچی شاعری بالخصوص ریکی، جام درک ملا فاضل، مست توکلی اور بالاچ گورگیج کے مطالعہ کے بعد انہوں نے بہت جلد خود کو اس اثر سے آزاد کر کے بلوچی شاعری کے رنگ و ڈھنگ کو اپنا لیا۔

میر گل خان نصیر کا عہد سماجی اور سیاسی تحرک کی ابتدا کا دور تھا۔ اس لیے اس دور میں وطن دوستی اور قوم پرستی کی تحریک کے زیر اثر شاعری کو وطن اور اس کے مظاہر سے قریب تر کرنے کی ایک شعوری اور فکری روش سامنے آیا۔ میر گل خان نصیر نے بھی اپنی شاعری کے ذریعے بلوچ عوام میں جذبہ حریت ابھارنے اور انہیں انگریزی استعمار اور ان کے کاسہ لیسوں کے خلاف منظم کرنے کی کوشش کی۔ سماج کے ایک بلند تر سطح پر قوم کو مخاطب کرنے کے نتیجے میں ان کی شاعری میں داخلی رخ کی بجائے سماجی

اورقومی رخ زیادہ نمایاں ہوکر سامنے آئی۔

میر نصیر نے جہاں ایک طرف جمہور میں آزاد رہنے کی تڑپ اور جدوجہد کرنے کی لگن پیدا کی، جوآزادی اور انقلاب کا خاصہ ہوتی ہے۔تو دوسری طرف انہوں نے اپنی شاعری میں جدت اظہار کے نئے شعری سانچے بنانے کی شعوری کوشش کی اور بلوچی شاعری کے مختلف شعری مزاجوں اور لہجوں کوایک لڑی میں پروکر ایک نئے شعری نظام کی بنیاد رکھی۔جس سے جدید بلوچی نظم کا مزاج ایک بہت بڑی تبدیلی سے ہمکنار ہوئی۔

میر نصیر سے پیشتر کلاسیکی بلوچی نظم قدیم بلوچی معاشرت کے محدود اخلاقی ،سماجی اور معاشرتی مقاصد کے گرد گھومتی تھی۔جبکہ میر نصیر نے فکری اور فنی سطح پر نظم کو موضوعاتی وسعت اور فنی دبازت عطا کی۔جس کا ہماری شاعری میں اس سے پہلے تصور بھی نہیں تھا۔

''گلبانگ'' کے بعد میر نصیر کا دوسرا شعری مجموعہ ''شپ گروک'' گوکہ ۱۹۶۴ء میں شائع ہوا۔لیکن اس میں ان کی ۱۹۵۱ء سے لے کر ۱۹۶۰ء تک کی تمام تر شاعری کی بجائے صرف بیالیس ۴۲ نظمیں شامل ہیں۔جو''گلبانگ'' کی شاعری کی نسبت زیادہ فنی رچاؤ اور تخلیقی پختگی اور گہرائی کا مظہر ہیں۔اس کی بڑی وجہ میر نصیر کا ذہنی اور فکری ارتقاء ہے جو وقت، ماحول اور حالات کے تناظر میں زیادہ گہرا، وسیع اور پختہ ہوتا گیا۔

۱۹۷۰ء میں میر نصیر کی شاعری کا اہم مجموعہ ''گرند'' شائع ہوا۔''گرند'' کی بیشتر شاعری ملک کے مختلف جیلوں میں تخلیق کی گئی نظموں پر مشتمل ہے۔جس میں فنی

اور موضوعاتی سمیت اپنے وطن اور وطن زادوں کی محبت سے سرشار ان کی سوچ ایک عالمگیر فکر میں ڈھلتی ہوئی نظر آتی ہے۔ تاریخ کے جدلیاتی عمل اور اس کے جبر کا شعور رکھتے ہوئے وہ تیسری دنیا کے مظلوم اور محکوم قوموں کی غلامی اور استحصال کو سرمایہ پرست قوتوں اور ان کے استحصالی نظام کا شاخسانہ قرار دیتے ہیں۔ اس طرح ''گلبانگ'' سے لے کر ''گرند'' تک کے تخلیقی سفر میں میر نصیر کا فکری اور فنی شعور بدلتے حالات کے تناظر میں زیادہ پختہ، گہرا اور وسیع ہوتا گیا اور ان کے ہاں مقامیت کا جذبہ آفاقیت کے رنگ میں ڈھلتا گیا۔

آزادی کے بعد ۱۹۵۵ء میں ون یونٹ کا نفاذ، ۱۹۵۶ء میں مارشل لاء، ۱۹۷۲ء میں نیپ حکومت کی برطرفی اور پھر ۱۹۷۷ء کے مارشل لاء کے باعث بلوچستان پر سیاسی دباؤ کا سلسلہ جس طرح بڑھتا گیا، میر نصیر کی شاعری کا لب ولہجہ نہ صرف اتنا ہی زیادہ سخت، درشت اور تلخ ہوتا گیا بلکہ فکری اور عملی مزاحمت و انکار کے باعث انہیں مختلف ادوار میں پاکستان کے مختلف جیلوں میں ایک طویل عرصہ تک قید و بند رہنا پڑا۔

قیام پاکستان سے پہلے ان کی شاعری بدیسی آقاؤں کے خلاف تھی۔ جبکہ آزادی کے چند برسوں بعد ہی ان کو یہ احساس ہونے لگا کہ جس مقصد کے لئے یہ ملک حاصل کیا گیا۔ وہ نہ صرف پورا ہوتا نظر نہیں آتا بلکہ سماجی بے انصافی، طبقاتی جبر اور سیاسی دباؤ میں کچھ زیادہ ہی شدت اور سختی آنے لگی ہے۔ تو انہوں نے کھل کر اس جبر کے خلاف لکھنا شروع کیا۔ اس لئے بغاوت، مزاحمت اور انکار کا رویہ ان کے

یہاں ایک مستقل اور دائمی موضوع بنا رہا۔ اور بعد میں یہی رویہ ایک مرکزی روایت کے طور پر بلوچی شعری مزاج کا حصہ بنا رہا۔

میر گل خان نصیر کا شعری تصور اور ان کا فکری نظام بنیادی طور پر ترقی پسند ادبی تحریک سے نمو پاتی رہی ہے۔ وہ ادب برائے زندگی پر یقین رکھتے ہوئے ادب میں عصری صداقتوں اور تقاضوں کو اجاگر کرنے کی اہمیت پر زور دیتے رہے ہیں۔ یہاں یہ بات بھی پیش نظر رہنی چاہیے کہ بلوچی شاعری شروع دن سے ہی عصری شعور کا مظہر رہی ہے۔ یہ کسی بھی عہد میں اپنے گردوپیش اور ماحول سے بے تعلق نہیں رہی۔

کلاسیکی شاعری سے لے کر جدید شاعری تک بلوچ شعراء نے اپنی شاعری میں فنی محاسن کے ساتھ ساتھ روحِ عصر کو سمونے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ ادب میں کمٹ منٹ، وابستگی اور مقصدیت ہمیشہ ان کے پیش نظر رہی، بلوچ ادیبوں نے سماجی ذمہ داری کے سوال کو ادب میں نمایاں اہمیت دی۔ اور ان کے ہاں ادب کے بے مقصد ہونے کا تصور ہی نہیں ہے۔ کلاسیکی عہد کے نامور شاعر میر بیورگ نے تو یہاں تک کہا تھا کہ شاعری تو صرف بہادر لوگ ہی کر سکتے ہیں۔ ان کے نزدیک بزدل آدمی شاعر ہو ہی نہیں سکتا۔ کیونکہ بزدل آدمی نہ تو اپنی ذات سے کوئی کمٹ منٹ رکھتا ہے اور نہ ہی سماج سے کوئی وابستگی رکھتا ہے۔

جدید بلوچی شاعری بھی اسی کلاسیکی شعری تصور پر یقین رکھتی ہے۔ گو کہ جدید بلوچی شاعری ترقی پسند ادبی تحریک سے متاثر نظر آتی ہے اور اس پر اس تحریک

کے اثرات سے صرف نظر نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن اس تصور سے کہیں پہلے بلوچی شاعری ترقی پسند رجحانات کا مظہر رہی ہے۔ لیکن ترقی پسند کا یہ مظہر ایک غیر نظریاتی رجحان کے طور پر اس کے خمیر میں موجود تھی۔ جبکہ ۱۹۳۶ء کی شروع کردہ ترقی پسند ادبی تحریک کے اثرات کے سبب یہ غیر شعوری اور غیر نظریاتی رویہ ایک نظریاتی وابستگی کے طور پر بلوچی ادب میں نمودار ہوا۔

ترقی پسند ادبی تحریک کے زیر اثر پہلی بار ''بلوچستان میں ۵۲۔۱۹۵۱ء میں ''انجمن ترقی پسند مصنفین'' کی ایک شاخ کوئٹہ میں قائم ہوئی۔ جس میں مختلف زبانوں کے شاعر اور ادیب شامل تھے۔ کامل القادری، انجم قزلباش اس کام میں پیش پیش تھے۔ اس طرح بلوچی و دیگر زبانوں کے اندر ترقی پسند ادبی تحریک کے لئے زمین تیار کرلی گئی۔'' (۱۷)

بلوچستان میں ترقی پسند ادبی تحریک سے پہلے ۱۹۵۰ء میں ''لٹ خانہ'' کے نام سے ایک علمی، ادبی اور سیاسی تحریک شروع کی گئی۔ (۱۸)

عبداللہ جان جمالدینی، سردار بہادر خان بنگلزئی، انجم قزلباش، آزات جمالدینی، کامل القادری، ڈاکٹر خدائے داد، کمال خان شیرانی اور بہت سے دوسرے ادیب و سیاسی کارکن اس تحریک کے روح رواں تھے۔ جنہوں نے بلوچستان میں ترقی پسند ادبی رجحانات کے فروغ کے لئے اہم کردار ادا کیا۔

ترقی پسند ادبی تحریک کا مقصد یہ تھا کہ ''ادیب و شاعر کو اپنے ذاتی نہاں خانوں سے نکل کر انسانوں کے اجتماعی مفاد اور تہذیب و ثقافت کے اعلیٰ اقدار کے

تحفظ کے لئے رجعت پسند قوتوں کے مقابل آنا چاہیے اور اپنے فن کو انسانیت کی خدمت کے لئے وقف کر دینا چاہیے۔"(۱۹)

ترقی پسند ادبی تحریک کے زیر اثر ادب میں رومانیت کی بجائے حقیقت نگاری اور داخلیت کی بجائے معاشرے کے اجتماعی مسائل پیش کرنے کا رجحان عام ہوا۔ ترقی پسندوں نے طبقاتی تضاد اور فرق کے حوالے سے متوسط طبقے اور مزدوروں وکسانوں کے مسائل کو اپنا موضوع بنایا۔ بھوک، غربت، غلامی، جہالت اور جنس کے سوال کو بڑی جرأت اور بے باکی کے ساتھ اٹھایا۔ اس ادبی تصور سے بلوچ ادیب، شاعر اور دانشور متاثر ہوئے۔

سب سے پہلے میر نصیر اور آزات جمالدینی نے اس ادبی نظریے میں کشش محسوس کی۔ کیونکہ ایک تو اس وقت کے حالات ہی ایسے تھے کہ پورے برصغیر میں انگریزی استعماریت کے خلاف آزادی کی تحاریک چل رہی تھیں اور لوگوں میں قومی جوش وجذبہ اور بیداری کی لہر نمایاں تھی۔ دوسری طرف پہلی جنگ عظیم سے لے کر دوسری جنگ عظم کے اختتام تک ساری دنیا کے حساس اور عوام دوست ادیب وشاعر اس رجحان سے متاثر تھے۔

میر گل نصیر اور آزات جمالدینی نے جب شاعری شروع کی تو انہوں نے ادب میں سماجی ذمہ داری اور وابستگی کے سوال کو مدنظر رکھتے ہوئے عصری صداقتوں کی ترجمانی کو اپنے فن کا مقصد قرار دیا۔ اور بعد میں یہی رجحان ایک مرکزی روایت کے طور پر بلوچی ادب میں اپنے مستقل اثرات مرتب کرتا گیا۔

میر نصیر کے بعد مراد آوارانی، میر عیسے قومی محمد حسین عنقا اسحاق شمیم، آدم حقانی جمعہ کلانچی حکیم خدائے رحیم، ملا اسماعیل پھل آبادی نصیر خارانی قاضی عبدالرحیم صابر میر احمد دہانی میر محمود خان لچکی عنایت اللہ قومی مولوی محمد حسین عاجز، ملک محمد سعید دہوار، پیرل زبیرانی، نور محمد ہمدم، شوکت ندیم، انور قحطانی، احمد جگر نے بھی جدید بلوچی نظم کی بنیاد رکھنے میں اپنا کردار ادا کیا۔ اور ان سب کا موضوعاتی دائرہ بلوچ اجتماعیت، ملی جذبہ، سیاسی وسماجی شعور، بلوچ اور بلوچستان سے محبت، سرداروں کے مظالم اور غریبوں کی ابتر حالت جیسے تصورات کے گرد گھومتا نظر آتا ہے۔

گوکہ ان سب نے جدید موضوعات کو ہی اپنا مرکز خیال بنائے رکھا۔ لیکن ان کے یہاں موضوعات جدید ہونے کے باوجود ان کا طرز احساس روایتی ہی رہا۔ اس لیے محمد حسین عنقا کے سوا ان کے فکر وفن کو وہ گیرائی اور گہرائی میسر نہ آسکی جو انہیں کسی واضح اور منفرد رجحان ساز کے طور پر بلوچی ادب میں ایک الگ مقام عطا کرنے کا سبب بنتا۔ لیکن ان کیلئے یہ بات بھی کسی عز وفخر سے کم نہیں کہ جدید بلوچی شاعری کی تاریخ ان کا تذکرہ کیے بغیر آگے بڑھ ہی نہیں سکتی۔

میر محمد حسین عنقا بلوچ قومی تحریک کے ابتدائی راہنماؤں میں شامل تھے۔ جنہوں نے بلوچستان کے عوام میں سیاسی اور سماجی شعور پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ جدید بلوچی ادب کی ترقی وترویج میں اہم کردار ادا کیا۔ میر نصیر کی طرح وہ بھی بلوچ قومی تحریک کے شاعر، مورخ، ادیب، صحافی اور سیاستکار کی حیثیت سے سامنے آئے۔ انگریزوں کے خلاف "تحریکِ آزادی کے دوران سرکاری ملازمت سے

دلکش ہوئے۔ ''انجمنِ اتحادِ بلوچستان'' اور'' انجمن وطن'' میں رہے۔ جب ان سیاسی
تنظیموں کو خلاف قانون قرار دیا گیا۔ تو آپ نے کراچی کا رخ کیا۔ وہاں نہایت بے
سروسامانی میں کئی ایک اخبار نکالے جو یکے بعد دیگرے ضبط ہوتے رہے۔ سیاسی
سرگرمیوں میں پر جوش حصہ لینے اور حقوق کے لئے آواز بلند کرنے والوں میں آپ کی
آواز سب سے بلند تھی۔ مجموعی طور پر بائیس سال تک مختلف جیلوں میں محبوس رہے۔'' (۴۰)
نہ صرف بلوچ قومی حقوق کے لیے آواز بلند کرنے والوں میں ان کی آواز
سب سے بلند تھی بلکہ جدید بلوچی شاعری کے حوالے سے بھی ان کی آواز اپنے ہم
عصر شعرا کی نسبت زیادہ نمایاں اور منفرد ذائقہ کی حامل تھی۔ اگر چہ ان کی شاعری
موضوعات کے حوالے سے اپنے عہد کے شعرا سے زیادہ مختلف تو نہیں لیکن عصری
کرب اور فنی تازگی کے اعتبار سے ان کی شاعری بہر حال ایک الگ اور منفرد طرز
احساس رکھتی ہے۔ کریم دشتی ان کے فن کے بارے میں لکھتے ہیں کہ ''بلوچی شاعری
میں واجہ محمد حسین عنقا وہ پہلے شاعر ہیں جنہوں نے خود کو فارسی زدہ لب و لہجے سے دور
رکھتے ہوئے خالص بلوچی شاعری کی ہے۔ اس عہد کی شاعری اس حد تک فارسی زدہ
تھی کہ اس میں خیال، لب ولہجہ، الفاظ وتراکیب، بحر و وزن سب فارسی ہی کے تھے
۔ حتیٰ کہ اس وقت میر گل خان نصیر جیسا شاعر بھی خود کو فارسی اثرات سے علیحدہ نہ کر سکا
اور اس عہد کی شاعری کی خصوصیت کا معیار یہ سمجھا جاتا تھا کہ اس میں فارسی الفاظ و
تراکیب زیادہ سے زیادہ موجود ہوں، مگر عنقا نے ناسمجھ قارئین کو خوش کرنے کی بجائے
بلوچی زبان وادب کو اور اپنی شاعری کو اپنے خالص قلبی واردات و جذبات کے اظہار کا

وسیلہ بنایا۔"(۲۱)

میر محمد حسین عنقا بلوچی شاعری سے پہلے اردو اور فارسی میں شاعری کرتے تھے۔اور "۱۹۳۳ء میں اردو اور فارسی شاعری پر مشتمل ان کا شعری مجموعہ "رحیل کوہ" کے نام سے منظر عام پر آچکا تھا۔"(۲۲) میر گل نصیر کی بلوچی شاعری کی پذیرائی کی وجہ سے انہوں نے بھی اردو اور فارسی شاعری کو چھوڑ چھاڑ کر بلوچستان کے عوام ہی کی زبان میں شاعری کرنے کا فیصلہ کرلیا۔اور وہ اس میں کامیاب رہے۔

ان کی وفات کے کئی سالوں بعد ۱۹۸۶ء میں ان کا مجموعہ کلام "توار" شائع ہوا۔"توار" کی شاعری میں وطن اور اس کے مظاہر سے محبت، اپنی گم شدہ تہذیب کی بازیافت اور بدلتے عہد کے ساتھ بدلتے تقاضوں کی اہمیت ایک نیا فکر وخیال، سماجی و سیاسی شعور اور جدوجہد جیسے موضوعات شامل ہیں۔

اگرچہ اس میں کوئی شک نہیں کہ میر گل خان نصیر اور محمد حسین عنقا نے بلوچی نظم کے افق کو وسیع کرتے ہوئے جدید بلوچی شاعری کے ارتقا میں اہم کردار ادا کیا۔لیکن میر نصیر اور محمد حسین عنقا کے برعکس آزات جمالدینی نے نظم کو خارجی زندگی کے اظہار سمیت اس کے رخ کو داخلی دنیا سے ہم آہنگ کر کے نہ صرف اسے فرد کی ذات سے ہمکنار کیا۔بلکہ انہوں نے جدید بلوچی شاعری میں پہلی بار نظم آزاد کی بنیاد رکھنے اور اسے فروغ دینے میں بنیادی کردار ادا کیا۔

آزات جمالدینی سے پہلے بلوچی نظم پابند، نیم پابند اور نظم معرٰی ہیئتوں میں لکھی جاتی رہی ہیں، جن میں مقبول ہئیت پابند نظم کی ہے۔آزات جمالدینی سے

پہلے میر گل خان نصیر جیسا شاعر بھی کسی نئی ہیت کی ضرورت محسوس نہ کر سکے۔ حالانکہ انہوں نے سب سے پہلے غزل کی تنگنائے سے دامن بچا کر نظم میں نئے خیالات و تجربات کی ترویج پر زور دیا۔ اس کے باجود اُن کا عمومی رجحان پابند نظم کی طرف رہا ہے۔ لیکن انہوں نے پابند ہیئت میں فکر و خیال اور ہیئتی دونوں اعتبار سے بہت بڑے شعری تجربے کیئے۔

میر گل خان نصیر اور اس عہد کے دوسرے شعرا کے ہاں نظموں کے لیے سب سے زیادہ مقبول دو مصرعوں کی ہیئت رہی ہے۔ اس ہیئت میں بندوں کا بھی رجحان عام رہا جس کی رو سے ہر بند میں بحر ایک ہوتے ہوئے بھی قافیہ اور ردیف بدلے جا سکتے ہیں۔

میر گل خان نصیر چونکہ ترقی پسند شاعر تھا۔ اس لحاظ سے ان کا ادبی نقطہ نگاہ مقصدی اور افادی تھا۔ اس لیے ان کے لیے ہیئت کا تجربہ ثانوی حیثیت رکھتا تھا۔ میر گل خان نصیر کا مقصد اپنے افکار و تجربات کو براہ راست عوام تک پہنچانا تھا۔ ایسی صورت میں کسی نئی اور نامانوس ہیئت کا تجربہ ان کے مقصد کی راہ میں رکاوٹ بن سکتا تھا۔ اور انہیں یہ خدشہ تھا کہ کہیں قاری کی نظر خیالات کی بجائے فارم (Form) اور ہیئت کی پیچیدگی میں الجھ کر نہ رہ جائے اور وہ اپنی اصل مقصد سے ہٹ نہ جائے۔

اسی خدشہ کے پیش نظر اس نے کسی نئی ہیئت کو متعارف کرانے سے شعوری طور پر گریز کیا۔ اور یہی وجہ ہے کہ جب آزاد جمالدینی کے بعد عطا شاد نے قدرے

گنجلک اور پیچیدہ ''آزاد نظمیں'' لکھیں تو ان کو ہر طرف سے طعن وطنز کا نشانہ بننا پڑا۔ عطا شاد سے پہلے آزات جمالدینی کی ''نظم آزاد'' کی مخالفت اس لیے نہ ہوسکی۔ کیونکہ انہوں نے اس نئی ہیئت میں سادہ اور عام فہم انداز میں اپنے خیالات وتجربات کا اظہار کیا۔ جس سے قاری کیلئے کسی قسم کے ابلاغ کا مسئلہ پیدا نہ ہوا۔ اس کے ساتھ دوسری طرف اگر باریک بینی سے دیکھا جائے تو نظم آزاد کی ہیئت بلوچی ادب میں کوئی زیادہ نامانوس اور نئی چیز بھی نہیں تھی۔ کیونکہ کلاسیکی بلوچی شاعری کی ہیئت بہت حد تک نظم آزاد سے مماثلت رکھتی ہے۔ لیکن عطا شاد کی مخالفت ان کی اس نئی ہیتی تجربے سے کہیں زیادہ ان کے فکر وخیال کی پیچیدگی اور ابہام کی وجہ سے ممکن ہوا۔

جدید بلوچی نظم کی فکری اور فنی ارتقاء کے سفر میں آزات جمالدینی کا حصہ سب سے نمایاں ہے۔ کیونکہ انہوں جہاں ایک طرف بلوچی نظم کو فرد کی داخلی احساسات سے جوڑتے ہوئے اسے نئی کروٹوں اور نئی وسعتوں سے آشنا کیا تو دوسری طرف انہوں نے اپنے عہد کی سیاسی کشمکش، جبر و استحصال اور عصری صورتحال کو علامتوں اور استعاروں میں برت کر ایک نئے انداز سے نظم کی صورت گری کی۔ کلاسیکی شعری روایت کے مکالماتی انداز کو اپناتے ہوئے آزات جمالدینی کی نظمیں ''دوشی'' ''پرندوشی'' ''نہادی'' ''کشار'' ''پدریچ'' ''مایکان'' ''التجا'' ''دل زہیرواریں'' ان کی ذات اور عہد کے درمیان ایک ایسا مکالمہ ہیں جہاں اپنے عہد کے کٹہرے میں ایک معتوب دیوتا کی طرح کھڑے حالات کی چیرہ دستیوں، صعوبتوں اور زندگی کی محرومی اور تلخیوں کا دکھڑا سناتے نظر آتے ہیں۔

میر نصیر کے ''گلبانگ ۱۹۵۱ء'' کے بعد آزات جمالدینی کا ''مستیں توار'' جو جدید بلوچی شاعری کی دوسری شعری مجموعہ ہے، ۱۹۵۳ء میں شائع ہوئی۔ ''مستیں توار'' انکی ابتدائی شاعری تھی۔ اور اپنے عہد کے غالب طرز احساس سے ہم آہنگ ہونے کے باجود نسبتاً یہ ایک نئی ذائقہ کی حامل تھی۔ لیکن آزات جمالدینی اپنے تخلیقی سفر میں برابر ذہنی اور فکری مراحل سے گزرتے رہے۔ اور آنے والے ادوار میں وہ ایک رجحان ساز شاعر کے طور پر نہ صرف بلوچی شاعری میں اپنے مستقل اثرات مرتب کرنے میں کامیاب رہے۔ بلکہ وہ جدید نظم کو ایک نیا پیرایہ اظہار ،ایک نئی فکری اپج اور نئی معنویت دینے بھی کامیاب رہے۔ ''مستیں توار'' کی ابتدائی شاعری کے چند ایک نظموں کو چھوڑ کر ''رژن ۱۹۹۵ء'' میں (گو کہ ان کا یہ مجموعہ کلام ان کی وفات کے بعد ہی شائع ہوا) انہوں نے اپنے فن کی بنیاد وضاحت اور صراحت کی بجائے رمزیت اور اشاریت پر قائم کی اور انہوں نے اجتماعی احساس کو بھی انفرادی احساس اور ذاتی وژن کی روشنی میں پیش کر کے بلوچی شاعری کو ایک نئی جہت عطا کی۔

میر گل خان نصیر، محمد حسین عنقا، آزات جمالدینی اور اسی عہد کے دوسرے شعرا کے بعد ہیتی اور موضوعاتی اعتبار سے نظم میں جو کشادگی اور تازگی عطا شاد نے پیدا کی۔ بلوچی نظم کی تاریخ میں اس کا نظیر ملنا مشکل ہے۔ گو کہ عطا شاد سے پہلے نظم کی موضوعاتی دائرے کو جہاں ایک طرف میر نصیر نے بڑی کشادگی اور وسعت عطا کی تھی ۔اور نظم کے کینوس کو جدید طرز احساس سے ہم آہنگ کرنے کا کریڈٹ بھی انہی کو حاصل ہے اور اس کے ساتھ دوسری طرف آزات جمالدینی نے پابند نظم میں اظہار

خیال کرنے کے ساتھ ساتھ جدید بلوچی ادب میں پہلی بار نظم آزاد کی بنیادیں بھی رکھ دی تھیں اور اس میں بڑی شعری تجربے بھی کیئے۔

مگر عطا شاد کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے جدید حسیت کے ساتھ نئی نظم کی فنی اور فکر بنت کو نئی جہتوں، نئے رویوں اور نئے رجحانات سے آشنا کیا۔ اور اپنی تخلیقات میں نئے جذباتی اور فکری تجربات کو سمو کر انہوں نے نہ صرف نظم کے کینوس کو وسیع کیا بلکہ مروج لسانی پیٹرن کو بدل کر بلوچی شاعری میں نئی صورت گری کی۔

عطا شاد سے پہلے نظم کے ارتقاء کے باوجود اس کے ڈھانچے میں کوئی بڑی تبدیلی اور پیش رفت نظر نہیں آتی۔ لیکن یہ عطا شاد ہی تھے۔ جنہوں نے فنی اور فکری اعتبار سے نظم کو نئی بنیادیں فراہم کیں۔ شروع میں عطا شاد کے اس اجتہادانہ طرز عمل کی بھرپور مزاحمت اور مخالفت کی گئی۔ ان کی فکری اور فنی بصیرت کو ہر طرح سے مطعون کیا گیا۔ کیونکہ یہ نیا لہجہ اور نیا فنی پیٹرن ہماری مروجہ شاعری کے مزاج کا حصہ نہیں تھا۔

اس لیے شروع میں اس نئی ہیتی تجربہ کی مخالفت کی گئی مگر بعد میں آہستہ آہستہ نظم آزاد اپنی جگہ بنانے میں کامیاب رہی۔ اس طرح آزاد نظم بلوچی شعری تکنیک کے فطری ارتقاء کے مراحل طے کرتی رہی اور آگے بڑھتی رہی۔ یہاں یہ بات پیش نظر رہنی چاہیئے کہ عطا شاد سے پہلے آزات جمالدینی نے نظم آزاد کو اظہار کا وسیلہ بنایا تھا۔ لیکن ان کی آزاد نظم کی مخالفت اس لیے نہ ہوسکی کہ ان کا طرز احساس اور طرز اظہار غیر روایتی ہونے کے باوجود قاری کے لیے عام فہم اور آسان تھا۔ جبکہ عطا شاد کا طرز

احساس اور طرز اظہار مشکل ہونے کے سبب قاری کے لیے تفہیم کا مسئلہ بنا رہا جس کے باعث انھیں مطعون کیا گیا کیونکہ عطا شاد نے اپنے تجربات کے اظہار کے لیے نئے سانچے تلاش کیئے جو محض الفاظ کی تلاش ہی نہ تھی بلکہ نئے اظہار کی نئی صورتوں کی تلاش بھی ان کے پیش نظر رہی۔ ان کے اظہار کی یہی پیچیدگی قاری کے لیے ناپسند یدگی کا باعث بنی۔

عطا شاد کے ساتھ اشرف سربازی اور بعد میں صدیق آزات، کریم دشتی ، ملک طوقی، اکبر بارکزئی اور ہاشم شاکر نے بھی نظم آزاد کو نہ صرف متعارف کرانے بلکہ اسے نئی اور توانا بنیادیں فراہم کرانے میں اہم کردار ادا کیا۔ اور انہی کے کوششوں کے باعث ساٹھ کی دہائی کے آخری سالوں میں نئی نظم نئے کروٹوں اور نئے رویوں سے آشنا ہوئی۔ لیکن عطا شاد کی آواز اپنے عصری آوازوں میں بہت ہی نمایاں اور منفرد رہی۔ اور وہ جدید بلوچی شاعری میں ایک رجحان ساز (Trend Maker) شاعر کے طور پر سامنے آئے۔

عطا شاد نے ہی سب سے پہلے لفظوں کے توڑ پھوڑ سمیت نظم کے پورے کا پورا ڈکشن ہی بدل کر رکھ دیا۔ اپنے عہد کے مروجہ شعری نظام سے ہٹ کر اپنے تخلیقی عمل کے لیے ایک پراسرار رتمثالی زبان تخلیق کی۔ یہ پراسرار تمثالی زبان ان کی وضع کردہ پیچیدہ و محبوب تراکیب اور تہہ در تہہ ذاتی اور شخصی علامتوں کا ایک ایسا نظام ہے۔ جسے لفظی اور ظاہری سطح پر دیکھنا اور سمجھنا ممکن ہی نہیں۔ عطا شاد کے کرب کو سمجھنے کے لیے ان کی شخصی اور ذاتی علامتوں تک رسائی ضروری ہے۔ کیونکہ ان کے ساتھ ایک

ذہنی رشتہ استوار کیئے بغیر ان کی ذاتی اور شخصی علامتوں کی تہہ تک پہنچنا یا ان کے باطن میں جھانکنا ممکن نہیں ہے۔

عطا شاد کے ساتھ اکبر بارکزئی اور ملک طوقی بلوچی نظم کے ایسے دو بڑے نام ہیں۔جنہوں نے نئے موضوعات کی تلاش اور اظہار خیال کے نئے طریقوں اور نئے سانچوں کی دریافت کو اپنا مرکز خیال بنائے رکھا۔اور ہر دونوں نے اپنی تخلیقات میں نئے جذباتی اور فکری سچائیوں کو سموکر بلوچی نظم کو ایک یونیورسل وژن (Universalvision) عطا کیا۔جس سے ان کے یہاں نظم فکری اعتبار سے ایک نیا موڑ لیتے ہوئی نظر آتی ہے۔

بلوچی شاعری مجموعی طور پر بیک وقت قومی اور بین الاقوامی طرز احساس کی شاعری ہے۔اپنا وطن اور وطن زادوں کی محبت سمیت پورے بنی نوع انساں سے محبت بلوچی شاعری کا مشترکہ جذبہ ہے۔بلوچ شاعروں کے نزدیک انسان کا عالمگیر تصور قومیتوں کے وجود،ان کی زبان اور تاریخ وتہذیب کی نفی کرنے سے نہیں بلکہ قومیتوں کے باہمی اشتراک اور احترام سے پیدا ہوتا ہے اس لیے ان کے یہاں اپنی زبان ،تاریخ ،تہذیب اور ثقافت کی بازیافت کا عمل ایک جزو کے طور پر کل میں ڈھلتا ہوا نظر آتا ہے۔

بلوچی شاعری جمہوریت ،امن مساوات اور انسانی وقار و احترام پر یقین رکھتی ہے۔بلا کسی استثنیٰ کے بلوچ شاعروں نے دنیا بھر کے مظلوم،محکوم اور مجبور قوموں کے جدوجہد کو اور ان کے دکھ سکھ کو اپنا ہی دکھ سکھ سمجھ کر ان کے حق میں آواز بلند کی ہے۔

ملک طوقی اور اکبر بارکزئی کے یہاں یہی احساس اپنی پوری معنویت اور گہرے شعور کے ساتھ نمایاں ہے۔ان دونوں نے جہاں ایک طرف بلوچستان اور اس کے جنم زادوں کے دکھ اور درد کو اپنی تخلیقات کا مرکز بنایا۔وہیں پہ انہوں نے پورے بنی نوع انسان کے آشوب کو بھی اپنا ہی آشوب سمجھ کر اپنے فن میں جگہ دی ہے۔

انسانی ہستی اور انسانی وجود اور اس کے متعلقات کو پوری کائنات کے تناظر میں دیکھنے کے باعث ان کی سوچ اور شعور ایک فرد کا شعور اور سوچ ہونے کی بجائے ساری کائنات کی سوچ اور شعور میں ڈھلتا نظر آتا ہے۔

اکبر بارکزئی جہاں انسانی آزادی، عالمی اجتماعیت، امن، مساوات اور مقامیت کے حوالے سے بلوچستان کی سماجی، تہذیبی و ثقافتی پہچان اور تشخص کی بات کرتے ہیں۔وہیں پہ وہ فرد کو اندر کے انسان سے لڑنے اور متصادم ہونے کی ترغیب بھی دیتے ہیں۔ان کے نزدیک اس وقت تک ہماری لڑائی بے مقصد و بے سمت ہے۔جب تک کہ ہم خود کو ذاتی خواہشوں، جھوٹ، منافرت، تعصب، ریاکاری، تنگ نظری، انا پرستی اور فاشزم جیسے رویوں سے الگ نہیں کرتے۔

دلوش بگٹی، ظفر علی ظفر، الفت نسیم، غوث بخش صابر، محمد بیگ بیگل امیت ہوت (غفار ندیم)، مومن بزدار اور مولا بخش مشتاق بھی اس دور کی ایسی مختلف آوازیں ہیں۔جن میں ان کی ذاتی اور شخصی مفہوم کے اظہار کے علاوہ سماجی ماحول اور مفہوم کا اظہار بھی نمایاں ہے۔

کیونکہ ہر تخلیقی ادب ذاتی اور شخصی مفہوم رکھنے کے علاوہ ایک مخصوص سماجی اور معاشرتی ماحول اور پس منظر رکھتا ہے۔ یہی انفرادی اور اجتماعی مفہوم کے اظہار میں فنکار کی فنی بصیرت اور تخلیقی آگہی بنیادی کردار ادا کرتی ہے۔ جو فنکار کو بڑا چھوٹا بناتا ہے۔

دلوش بگٹی سماجی، معاشی اور معاشرتی طور پر بلوچستان کے ایک پس ماندہ ترین علاقہ کے باسی ہونے کے باجود ایک دیدہ ور اور دانشور شاعر کے طور پر بلوچی شاعری بالخصوص بلوچی نظم میں اپنا ایک منفرد مقام رکھتے ہیں۔ مارکسی اور ترقی پسند ادب سے متاثر ہونے کے سبب ان کی شاعری میں طبقاتی جبر و تضاد کا واضح ادراک اور شعور ملتا ہے۔ وہ قبائلی، جاگیرداری اور سرمایہ داری نظام کو انسانی سماج کی ترقی اور نشو ونما کے لیے سب سے بڑی رکاوٹ تصور کرتے ہیں۔ انکی شاعری میں طبقاتی شعور اور پرولتاری جدوجہد کا عنصر سب سے نمایاں ہے۔

ظفر علی ظفر کا اب تک کوئی شعری مجموعہ سامنے نہ آسکا مگر وہ پچھلے چالیس برسوں سے بڑے تواتر کے ساتھ غزل اور نظم ہر دونوں اصناف میں شاعری کر رہے ہیں۔ احساس کی شدت اور جذبے کا خلوص انکی شاعری کے نمایاں خاصیت ہیں۔

غوث بخش صابر نظم غزل دونوں اصناف میں شاعری کرتے ہیں۔ ان کے موضوعات میں اپنے گردوپیش کے مسائل کا حوالہ ایک نمایاں اور توانا جذبے کے طور پر دیکھنے میں ملتا ہے۔

غفار ندیم (امیت ہوت) نے اگرچہ بہت ہی کم لکھا۔ مگر جو کچھ انہوں نے

لکھا وہ ان کی فکری اور فنی پختگی کی دلالت کرتی ہے۔

الفت نسیم کی شاعری میں غم اور نا امیدی کا تاثر زیادہ گہرا ہے۔اس کا سبب شاید یہی ہوسکتا ہے۔ کہ وہ اپنے عہد کے سیاسی ،سماجی اور معاشرتی نشیب وفراز میں بطور ایک حساس شاعر خود بھی شامل رہا ہے۔اس لیے انہوں نے بلوچ عوام کے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں کو شدت کے ساتھ محسوس کیا ہے۔(۲۳)

مومن بزدار نے بہت سی خوبصورت اور کامیاب نظمیں بھی لکھی ہیں۔مگران کا اصل میدان غزل ہی ہے۔وہ غزل کے حوالے سے اپنا ایک منفرد اور الگ پہچان رکھتے ہیں۔مومن بزدار کی نظموں میں قومی اور مذہبی تاثر نہایت ہی گہرا ہے۔انہوں نے اپنے وطن اور ملک کی محبت کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ اپنی تخلیقات میں اجاگر کیا ہے۔

ڈیرہ غازی خان کے بلوچ قبائلی علاقہ کوہ سلیمان میں نظم کے حوالے سے مثنوی طرز کی طویل بلوچی کلاسیکی نظم ''دستانغ'' کی روایت موجود ہے۔اور اکثر وبیشتر شعرا اسی کلاسیکی صنف میں شاعری کرتے ہیں۔لیکن مومن بزدار نے ''دستانغ'' کی بجائے جدید نظم کو اپنا اظہار خیال بنایا۔اور اسے تاریخی اور قومی سوچ سے ہمکنار کیا۔

مومن بزدار کے اثرات کے باعث ہی کوہ سلیمان میں نئی نسل کے شعرا نے ''دستانغ'' کی روایت کے برعکس جدید رویوں اور رجحانات کو اپنا لیا جبکہ بہت سے بے شمار پرانے اور نئے شاعر اب بھی اسی صنف کو اظہار کا وسیلہ بنائے ہوئے ہیں۔نور بخش بزدار،سید خان بزدار،غوث بخش وفا،حیدر بخش،غلام نبی کوھیانی،خیر محمد

دھانی لعل خان بلوچ ،کمال خان ،غلام فرید لدوانی بزدار ،ملک محمد مضان ،درانی قیصرانی ،حاجی اللہ بخش بزدار،جنیوا قیصرانی،شمس بزدارنورن ملک غفورلیغاری ،بشکیہ بلوچ صدیق چنال ،حافظ محمد حیات بزدار موارہان بزدار، علی شیر ،باجھی بزدار،مٹھابزدار ،عبدالمجید بزدار ،خدابخش دزکانی ،خدابخش بزدار،دین محمد شیدا بزدار،خیرن بلوچ اور صلاح الدین بزدار دستانغ کے نمایاں نام ہیں ۔(۲۴) مری بلوچوں میں محمد خان پیرزادانی،سیدو پیرزادانی میراخان رحملی زی دستانغ کے بڑے نام ہیں۔علاوہ ازیں کھوسہ،بگٹی ،دریشک ،مزاری اور گورچانی قبائل میں بھی دستانغ کی صنف کونمایاں مقبولیت حاصل ہے۔

محمد بیگ بیگل کی شاعری میں قومی اور سیاسی رنگ نمایاں ہے۔مقصد اور نظریہ کے اظہار کے حوالے سے وہ ایک علیحدہ طرز احساس کے مالک ہیں۔''وہ مختصر بحر میں شاعری کرتے ہیں۔جن میں شعری رچاؤ اورفنی پختگی نمایاں ہے بیگل آزاد شاعری کرتے ہیں۔ان کی شاعری میں امیدورجائیت اورایک روشن مستقبل کا تصور نمایاں ہے۔وہ مسلط شدہ غریبی ،بدحالی اور پس ماندگی جیسے حالات سے سمجھوتہ نہیں کرتے بلکہ وہ ان عارضی اور وقتی مصائب ومشکلات کو دائمی خوشحالی،خوداختیاری اور امن کی دہلیز تک پہنچنے کا زینہ تصور کرتے ہیں۔(۲۵)

نظم کے حوالے سے بشیر بیدارایک منفرد مقام رکھتے ہیں۔جوساٹھ کی دہائی کے آخری سالوں اورستر کی دہائی کی ابتدامیں سادہ مگر پرتاثیر لہجے کے باعث نئی نسل کے نمائندہ شعرابن کرسامنے آئے۔بشیر بیدار کاعوامی لہجہ جلد ہی ان کی مقبولیت کا

باعث بنا۔انہوں نے اپنے عہد کے کرب کو دوراز کار تشبیہوں، علامتوں کی بجائے روز مرہ کے لفظوں میں سمیت کر شعر کی کینوس پر منتقل کر دیا۔

بنیادی طور پر ان کی شاعری درد کی شاعری ہے بنی نوع انساں کے کرب کی شاعری ہے۔ زندگی کا درد اور اجتماع کا درد ان کی شاعری کا بنیادی موضوع ہے۔ اور یہ درد کبھی للکار بن کر سامنے آتا ہے اور کہیں یہ درد اپنے عہد کی صورتحال کا المیائی منظر پیش کرتا نظر آتا ہے۔

بشیر بیدار کے اب تک تین شعری مجموعے ''گور بام ۱۹۸۲ء'' ''ھز ام ۱۹۹۰ء'' اور ''کریاب ۱۹۹۹ء'' منظر عام پر آچکے ہیں اور وہ ان تینوں شعری مجموعوں میں برابر ذہنی ارتقا سے گزرتے نظر آتے ہیں۔لیکن کہیں وہ اپنے آپ کو دہراتے بھی نظر آتے ہیں۔

بشیر بیدار سے پہلے جی۔آر۔ملا بلوچی شعری افق پر نمودار ہوئے۔وہ غزل اور نظم ہر دو اصناف پر دسترس رکھتے ہیں۔جی۔آر ملا کا موضوعاتی تانا بانا بلوچستان اور اس کے باسیوں کے گرد بنتا نظر آتا ہے۔

وطن کی محبت سے سرشار شاعری اور ان کا لب ولہجہ انکے عہد کے شعرا سے بہت حد تک مختلف دکھائی دیتا ہے۔ان کے لہجے میں کہیں کہیں میر گل خان نصیر کی طرح بلند آہنگی اور خطابت کا زور وجوش نمایاں ہے۔لیکن میر گل خان نصیر ہی کی طرح یہ بلند آہنگی اور خطابت نعرہ یا سٹیٹمنٹ ہونے کے برعکس فنی رچاؤ اور تخلیقی پختگی کا حامل ہے۔فنی طور پر جی۔آر ملا نے بلوچی نظم کو ایک نئی جہت اور وسعت عطا کی۔

اسی عہد میں ابراہیم عابد، انور صاحب خان، اکرم صاحب خان، اسماعیل ممتاز، غنی پرواز، غلام فاروق، غوث بہار، اُستاد عبدالمجید گوادری، عبدالمجید شیرزاد، برکت اللہ بلوچ، غنی غریب، عباس علی زیمی، رزاق نادر، اقبال راز، دوست محمد توفیق، صفدر مری (سرفراز مری)، غلام حسین شوہاز بلوچ اور پیر بخش پیرل غزل اور نظم ہر دو حوالوں سے اپنا الگ الگ شناخت اور پہچان رکھتے ہیں اور ان کی شاعری میں ان کی ذات اور مقامیت کا دکھ نمایاں ہے۔

ابراہیم عابد کے اب تک چار شعری مجموعے نیکیں واھگ ۱۹۷۵ء، شہم ۱۹۸۵ء، نمیران ۱۹۹۵ء اور ان کے نعتیہ کلام کا مجموعہ ''مادنیں راہ'' شائع ہو چکے ہیں۔ انکی شاعری میں شخصی کرب کے علاوہ سیاسی اور انقلابی موضوعات کا عمل دخل نمایاں ہے۔

انور صاحب خاں اور اکرم صاحب خاں بلوچی زبان کے نامور مزاح نگار ہیں۔ نثر اور نظم میں مزاح نگاری کے حوالے سے انہوں نے بہت سی موضوعات پر سنجیدہ نظمیں بھی لکھی ہیں۔ لیکن انکی تخلیقات کا واضح رجحان نثر ہی رہا ہے۔

غلام فاروق بلوچ، اسماعیل ممتاز اور پیر بخش پیرل بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں۔ غزل کے علاوہ انہوں نے نظمیں بھی لکھی ہیں۔ ان کی نظموں میں زیادہ تر سیاسی اور سماجی اشارات کی عکاسی دیکھنے میں آتی ہیں۔

غوث بہار بلوچی زبان کے نامور ادیب اور افسانہ نگار ہیں۔ افسانہ نگاری کے ساتھ ساتھ وہ شاعری بھی کرتے ہیں۔ ان کی شاعری اپنی ذات اور اپنے جنم

زادوں کی تلخیوں ،محرومیوں اور مصائب و مشکلات سے عبارت ہے۔تلخیوں اورمحرومیوں کے اظہار کے ضمن میں ان کی لہجے میں درداور دکھ کا عنصر بڑی شدت کے ساتھ نمایاں ہے۔

اپنے عہد کے غالب رجحان کے طور پر اقبال راز اور دوست محمد توفیق کی شاعری میں ان کے عہد کا المیہ ایک جذباتی اور مزاحمتی پیرایہ اظہار لیئے نظر آتا ہے۔ جس میں مصائب اور مشکلات کی نشاندہی سمیت ان سے نبرد آزما ہونے کی ترغیب اور تحریک ملتا ہے۔

برکت اللہ بلوچ نے شروع میں رومانی شاعری کی مگر بعد میں جوں جوں گردوپیش کے بارے میں ان کی سوچ وفکر اور آگہی کی سطح وسیع ہوتی گئی تو اس کی شاعری کا لہجہ اور ذائقہ بھی بدلتا گیا اور اس کی شاعری میں قومی شعور واحساس کا عنصر غالب آتا گیا۔(۲۶)

غنی غریب کی شاعری میں زندگی کی تلخیوں،محرومیوں اور مصائب ومشکلات کے اظہار کے علاوہ اپنے وطن سے شدید محبت اور والہانہ لگاؤ کا اظہار ملتا ہے۔اور انہوں نے اپنی شاعری میں جابجا انہی موضوعات کو اپنا مرکزِ خیال بنائے رکھا۔

رزاق نادر بلوچی شاعری میں اپنے عہد کے دوسرے شعراء کی نسبت بہت حدتک اک نئی آواز کے ساتھ داخل ہوئے ہیں ان کے ہاں بلوچی روایت کا لہجہ عصری صداقتوں سے مل کر ایک نئے اور منفرد لہجے کی تخلیق کا باعث بنا ہے۔ جو انہی سے مخصوص ہے۔ان کے شعری مجموعہ ''واب سبزنت پدا ۱۹۹۸ء'' میں موجود سے عدم

اطمینان اور تبدیلی کی خواہش نمایاں ہے۔ اور ان کے یہاں مزاحمت کی لہر استعاراتی انداز میں بین السطور چلتی رہتی ہے۔

رزاق نادر کے علاوہ غلام حسین شوہاز بھی ایک منفرد لہجے کے مالک ہیں، جن کے اب تک دو شعری مجموعے ''جلبار ۱۹۹۴ء'' اور ''جلہار ۲۰۰۰ء'' شائع ہوئے ہیں۔ اور یہ دونوں شعری مجموعے ایک نئے ذائقہ کے حامل ہیں۔ ''شوہاز کی شاعری فکر و خیال کی بلندی سمیت حسن و خوبصورتی کی شاعری ہے۔ وہ نہایت ہی خوبصورت اور خوش نما لفظوں سے اپنے باطنی خیالات اور روح کی آرزؤں اور جذبوں کی عکاسی کرتے ہیں۔ ان کے الفاظ دھنک رنگوں کی طرح ہیں۔ وہ انہیں جس طرح سے بھی استعمال کرتے ہیں خوبصورت اور خوش نما لگتے ہیں۔'' (۲۷)

جدید نظم کے حوالے سے استاد عبدالحمید گوادری کی شاعری بھی اپنا ایک الگ ذائقہ رکھتی ہے۔ انہوں نے زیادہ تر قومی اور تاریخی شعور کی حامل نظمیں لکھیں جن میں وطنیت کا جذبہ، دھرتی سے محبت اور موجود سے عدم اطمینان کے باوجود امید اور رجائیت کا عنصر نمایاں ہے۔ ''گلیں باندات'' کے نام سے ان کا شعری مجموعہ ۱۹۸۹ء میں منظر عام پر آ چکا ہے۔ غنی پرواز بلوچی زبان کے ایک نامور افسانہ نگار ہیں۔ افسانہ نگاری کے علاوہ وہ شاعری بھی کرتے ہیں۔ غزل اور نظم ہر دونوں اصناف میں طبع آزمائی کرتے ہیں۔ لیکن وہ غزل کی نسبت نظم کو زیادہ ترجیح دیتے ہیں۔ بلوچی شاعری میں سب سے پہلے وہ ''آزاد غزل'' کا تجربہ بھی کر چکے ہیں۔ لیکن ''آزاد غزل'' نہ اردو میں کامیاب ہو سکا ہے اور نہ ہی بلوچی میں اس کو کوئی پذیرائی مل سکی ہے۔ ان کے

اب تک دو شعری مجموعے ''موسم اِنت وداراتی ۱۹۹۸ء'' اور ''کسی نہاں ماتیں وتن ۲۰۰۱ء'' شائع ہو چکے ہیں۔غنی پرواز کے نظموں میں موضوع اور مواد کے حوالے سے فکر وخیال کی گہرائی و گیرائی تو ہے لیکن کہیں کہیں دوٹوک حقیقت نگاری کے باعث ان کی نظمیں سپاٹ اور کھردرے پن کا شکار ہوگئی ہیں۔واقعہ نگاری اور منطقی اندازِ فکر نے ان کی شاعری کی روح کو گرانبار کیئے رکھا ہے۔غنی پرواز نے اپنی تخلیقات میں شعری حسن، نغمگی اور شعر کی جمالیاتی پہلوؤں کے برعکس فارم کے تجربات پر زیادہ زور دیا ہے۔جس سے ان کے بارے میں ''فارم کا شاعر'' ہونے کا تاثر ابھرنے لگا ہے۔

سرفراز مری جو اپنے قلمی نام سے صفدر مری مشہور تھے، نظم کے شاعر تھے۔ اگر چہ ان کی شاعری بلوچی رسائل وجرائد کی زینت نہ بن سکی اور نہ ہی وہ ادبی حلقوں میں متعارف ہو سکے۔لیکن ان کی شاعری کا جو قلمی بیاض ملا ہے۔اس سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ وہ فکری طور پر مارکسزم اور سوشلزم سے متاثر تھے اور ان کے کلام میں جا بجا انہی نظریات و تصورات کے حوالے ملتے ہیں۔ احتجاج، بغاوت ، جدوجہد، انقلاب اور تبدیلی ان کی نظم کے نمایاں موضوعات ہیں۔

عبدالحمید شیرزاد کی شاعری کا توانا رخ قومی اور سماجی ہے۔ان کی شاعری اپنی سرزمین اور جنم زادوں کے لئے جدوجہد کا حوالہ ہے۔تبدیلی اور ترقی کی خواہش اور جذبہ ان کی شاعری کا خاصہ ہے۔(۲۸)

عباس علی زیمی زیادہ تر نثری نظم لکھتے ہیں ۔ان کے اب تک تین شعری

مجموعے ''ھینار ۱۹۸۶ء''، ''الہان ۱۹۸۷ء'' اور ''مہرءِ بزگی ۱۹۹۹ء'' شائع ہو چکے ہیں۔ ان کی شاعری میں قومی اور سماجی سوچ ایک نمایاں اور توانا جذبے کے طور پر سامنے آیا ہے۔ ان کا پہلا شعری مجموعہ ''ھینار'' جو کہ ۱۹۸۶ء میں منظر عام پر آیا تھا، اس میں ان کی غزلیں اور نظمیں شامل ہیں۔ ابتدائی کلام ہونے کے اعتبار سے ''ھینار'' کی شاعری میں فنی پختگی اور تخلیقی کرب نظر نہیں آتی۔ ''ھینار'' کے ایک سال بعد ۱۹۸۷ء میں ان کا دوسرا شعری مجموعہ ''الہان'' کے نام سے چھپا، جس میں نثری نظمیں شامل ہیں۔

''ھینار'' کی نسبت ''الہان'' کی شاعری میں فنی پختگی اور تخلیقی کرب زیادہ گہرا اور نمایاں ہے۔ ''مہرءِ بزگی'' میں نثری نظموں کے علاوہ ان کے بعض افسانے اور افسانچے بھی شامل ہیں۔ مجموعی طور پر وہ اپنے شعری سفر میں برابر ذہنی ارتقاء سے گذرتے نظر آتے ہیں۔

ستر کی دہائی کے آخری سالوں اور اسی کی دہائی کے شروع میں اللہ بشک بزدار، مبارک قاضی، صبا دشتیاری سلطان نعیم قیصرانی، ڈاکٹر فضل خالق، ڈاکٹر علی دوست، عابد آسکانی، پیرل شے تگری، اسلم ابرار، غنی پہوال اور اسی کی دہائی کے وسط میں حفیظ حسن آبادی، منیر مومن، گل محمد وفا، رزاق دیدگ، ممتاز یوسف، عبید شاد، اور نوے کی دہائی اور اس کے بعد آنے والے سالوں میں جمعدار امیر احمد بزدار، منظور بسمل، چراگ لاشاری، اے۔آر۔داد، سلام چاکری، ارشاد پرواز، منظور بلوچ، صادق مری شامیر، مندوست بگٹی کے علاوہ نئے شاعروں کی ایک بڑی تعداد سامنے

آئی۔ جنہوں نے غزل اور نظم ہر دو اصناف کی جانب توجہ دی اور ان اصناف کے کینوس کو وسیع تر بنانے کے لئے نئے تجربات کیں۔ ان کے ہاں نیا احساس، نیا رجحان اور نئے موضوعات کا ایک وسیع پھیلاؤ دیکھنے میں ملتا ہے۔

اللہ بشک بزدار اپنے نرم و ملائم اور کومل لہجے کے ساتھ نئی نظم میں وارد ہوئے۔ فیض احمد فیض کی طرح رومانیت کے ریشمی لفظوں (Silky words) میں لپٹا ہوا ان کا خوبصورت اور دھیما لہجہ کوئے یار سے سوئے دار کا سفر کرتا نظر آتا ہے۔ بزدار نے بھی اپنے عہد کے دکھ کو محبوب کی آنکھ سے گذار کر کائنات کے بیکراں سینے میں پیوست کر لیا۔ وہ محبوب کو مرکز بنا کر کبھی وطن کو اس کے روپ میں دیکھتے اور محسوس کرتے ہیں اور کبھی وطن کو محبوب کے قالب میں اتارتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

محبت کے جذبے کو جو اللہ بشک بزدار کی شاعری کا مرکزی نقطہ ہے، جتنی شدت، خلوص اور دیانت کے ساتھ انہوں نے اپنی شاعری میں برتا ہے شاید ہی کسی دوسرے نے اسے برتا ہو۔

بزدار کی شاعری کا لینڈ سکیپ جہاں ایک طرف بلوچستان کی خوبصورت اور حسیں وادیوں، آبشاروں مرغزاروں، چشمے اور چراگاہوں، موسموں، ہواؤں، رنگ و روشنیوں، کونجوں کی ڈاروں، ساز و سرود کی محفلوں اور یاروں، دوستوں اور سنگی بیلیوں کی محفلوں سے ترتیب پاتا ہے، وہیں پہ دوسری طرف ان کی نظم کی خوبصورتی اور ان کے لہجے کا مٹھاس بلوچی لوک ادب کی مشہور صنف ''ڈیہی'' کے خمیر اور بو باس سے نمو پاتی ہے۔

عطا شاد ہی کی طرح وہ بھی بلوچی شاعری میں ایک رجحان ساز شاعر کے طور پر سامنے آئے ہیں۔ اور نئی نسل کے شعراء پر جس طرح عطا شاد کی شاعری کے اثرات کا چھاپ نظر آتا ہے۔ اسی طرح بہت سے ہم عصر شعراء کی شاعری میں ان کے رنگ و آہنگ کا عکس نمایاں ہے۔

طرز اظہار کے اعتبار سے ن۔م۔ راشد کو جو مقام اردو نظم میں حاصل ہے وہی مقام عطا شاد بلوچی نظم میں رکھتے ہیں۔ اور اسی طرح سے فیض احمد فیض اردو شاعری میں جس لب و لہجے کے مالک ہیں، بلوچی شاعری میں اللہ بشک بزدار نہ صرف ایسے ہی طرز سخن کے خالق ہیں بلکہ ان کی شاعری پر فیض احمد فیض کے اثرات بخوبی دیکھے جاسکتے ہیں۔

اللہ بشک بزدار کے علاوہ مبارک قاضی بلوچی شاعری میں اپنا ایک الگ تھلگ اور منفرد پہچان رکھتے ہیں۔ گوکہ رومان مبارک قاضی کی شاعری کا بنیادی سطح ہے لیکن وہ عشق کے تجربے کو انسانی سطح پر محسوس کرتے ہیں اور اسے اپنے عہد کی سیاسی اور سماجی صورتحال سے جوڑتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

مبارک قاضی ایک باشعور شاعر ہونے کے اعتبار سے اپنے عہد کے تقاضوں اور سچائیوں کا مکمل ادارک رکھتے ہیں۔ وہ حالات واقعات کو ہمیشہ تجزیہ کی دھار پر پرکھتے ہیں۔ وسعت نظری، عمیق شاہدہ، احساس وجذبہ کی شدت ان کے فن کا بنیادی خاصہ ہے۔

عطا شاد کی طرح ان کے یہاں لفظوں کی توڑ پھوڑ ان کے شعور اور کہیں

لاشعور کے ردعمل کا نتیجہ ہے۔ جدید لسانی اور فنی پیٹرن اور نئی تفظیات کے حوالے سے ان کا فن اپنے عہد کے دوسرے شعرا سے نہ صرف مختلف ہے۔ بلکہ ایک الگ طرز اظہار کا حامل بھی ہے۔

پروفیسر صبا دشتیاری کی شاعری کسی خاص نظریہ یا مسلک کے تابع نہیں ہے۔ بلکہ عصری مسائل اور عصری شعور ان کی شاعری کا بنیادی موضوع ہے۔ عصری مسائل کے حوالے سے انہوں نے خارجی دباؤ اور سیاسی جبریت سمیت بلوچستان کی موضوعی صورتحال، عوام کی خودفریبی، خودفراموشی، خوش فہمی، بے حسی و بیگانگی، بلوچستان کے سیاسی اور سماجی قوتوں کی پسپائی، ریاکاری، منافقت، نااہلی اور ان کے منفی رول و کردار جیسی صورتحال کو اپنی شاعری میں جگہ دی ہے۔ جس سے ان کی شاعری میں عصری تازگی اور سچائی سمیت ایک عصری کرب و اضطراب در آئی ہے۔

ڈاکٹر فضل خالق کی شاعری میں تبدیلی کی خواہش اور جستجو نمایاں ہے۔ وہ موجود سے عدم اطمینان کا اظہار کرتے ہیں۔ اور ایک ایسی زندگی کا خواب دیکھتے ہیں۔ جہاں پیار محبت، امن و آشتی بنی نوع انسان کا مقدر بنے۔

ملک طوقی اور اکبر بارکزی کی طرح سلطان نعیم قیصرانی کی شعری زبان فکر و دانش کی زبان ہے۔ جہاں وہ شعور و دانش کے ایک بلند تر سطح پر اپنے وطن زادوں سے مخاطب ہوتے ہیں۔ گوکہ انہوں نے کم ہی لکھا ہے۔ تاہم ان کی تخلیقات میں تاریخی، سماجی اور سیاسی شعور کی کئی کروٹیں دیکھنے میں آتی ہیں۔

ایک دانشور ہونے کے ناطے سے وہ تاریخ کے عمل اور اس کے جبر دونوں

سے واقف ہیں۔ وہ مسائل سے نبرد آزما ہونے اور عمل اور جدوجہد پر اکسانے سے پہلے لوگوں کو کھلی آنکھ اور کھلے دماغ سے سوچنے اور سمجھنے کی ترغیب دیتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ لوگوں کو تاریخی اور سماجی شعور دیئے بغیر انہیں بدصورتی ناانصافی استحصال، ظلم وجبر اور طبقاتی نظام کے خلاف منظم نہیں کیا جا سکتا۔

ڈاکٹر علی دوست بلوچی زبان کے ایک معروف قلمکار اور شاعر ہیں۔ ان کا ایک شعری مجموعہ ''ابیتگیں راھسر ۱۹۹۹ء'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ ان کی شاعری میں ان کی ذات اور مقامیت کے دکھ کے اظہار سمیت عالمگیریت کا احساس بھی نمایاں ہے۔

نظم نگاری کے حوالے سے عابد آسکانی ایک منفرد ذائقہ کے حامل شاعر ہیں۔ بلوچی زبان پر مکمل دسترس رکھنے کے باعث ان کی شاعری میں ایک قسم کا تنوع اور چاشنی ملتی ہے۔ سنجیدہ شاعری کے علاوہ مزاحیہ شاعری پر مشتمل ان کا ایک شعری مجموعہ ''چشیں شوم ءشانزدہ ۲۰۰۰ء'' کے نام سے شائع ہوا ہے۔ جس میں مختلف سماجی اور معاشرتی موضوعات پر انہوں نے ایک اچھوتے انداز میں اظہار خیال کیا ہے۔

حفیظ حسن آبادی ایک اچھے افسانہ نگار ہیں۔ افسانہ نگاری کے ساتھ ساتھ وہ غزل اور نظم ہر دو اصناف میں طبع آزمائی کرتے ہیں۔ ان کا ایک شعری مجموعہ ''ہوشام ۱۹۸۶ء'' کے نام سے منظر عام پر آ چکا ہے۔ ان کی شاعری میں اپنے وطن اور اس کے مظاہر سے محبت کا جذبہ موجزن ہے۔ بلوچستان کے فرسودہ سماج اور قبائلی نظام کو

بدلنے کیلئے ان کے ہاں انقلاب اور تبدیلی کی خواہش بڑی شدت کے ساتھ نمایاں ہے۔

منیر مومن غزل اور نظم ہر دو اصناف میں شاعری کرتے ہیں۔ لیکن نظم کی بجائے غزل ہی ان کی پہچان بنتی ہے۔ فکر وخیال کی بجائے ان کے یہاں جذبہ واحساس (Poetic Sensibilities) کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ جو جمالیاتی احساسات وجذبات کے بہت سے پہلوؤں کو بے نقاب کرتی ہے۔

''نگاہِ باطن ءِ سفر'' ان کا اولین شعری مجموعہ ہے جو ۱۹۹۹ میں شائع ہوا۔ ان کے اس مجموعے میں ان کی نظمیں اور غزلیں شامل ہیں۔ اس مجموعہ میں شامل ان کی بعض نظموں کو تو صرف (Poetry of Sounds) ہی کہا جا سکتا ہے۔ جس میں شاعرانہ فکر وخیال کے برعکس لفظوں کی آہنگ اور تال میل سے کام لیا گیا ہے۔ تاہم مجوعی طور پر ان کی شاعری بلوچی ادب میں ایک قابل قدر اضافہ ہے اور بلاشبہ انہوں نے اپنے لیے ایک نیا لہجہ دریافت کرنے کی کوشش کی ہے۔

اسی ۸۰ کی دہائی کے وسط میں ابھرنے والے نئے شعرمیں سے ممتاز یوسف، رزاق دیدگ، گل محمد وفا اور عبید شاد بھی اپنے لب ولہجہ کے اعتبار سے منفرد حیثیت کے حامل ہیں۔ گل محمد وفا اور رزاق دیدگ مرحوم بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں۔ اور انہوں نے بہت حد تک بلوچی غزل کو ایک نیا ذائقہ عطا کیا۔

ممتاز یوسف نظم کے شاعر ہیں۔ ان کی شاعری میں جذبہ بھی ہے اور نظریہ بھی احساس کی شدت اور جذبے کا خلوص ان کی شاعری کے نمایاں خاصیت ہیں۔

ایک بہتر معاشرے کی تخلیق وتعمیر ان کے فن کا مرکزی نقطہ ہے۔ جس کے لیے وہ زندگی کے فرسودگی کو بدلنے کے لیے تبدیلی اور انقلاب کے آرزومند نظر آتے ہیں۔

نوے کی دہائی میں اگر چہ غزل اور نظم ہر دو میدان میں نئے شاعروں کی ایک بڑی تعداد سامنے آئی۔ لیکن گنتی کے چند ایک شعراء کے سوا کوئی بڑا تخلیق کار سامنے نہ آ سکا۔ اور نہ کوئی رجحان ساز تبدیلی دیکھنے میں آ سکی۔ البتہ منظور بسمل چراگ لاشاری، جمعدار امیر احمد بزدار ارشاد پرواز صادق مری، شامیر اور سلام چاکری چند ایک ایسے نام ہیں جو غزل اور نظم کے میدان میں بہت حد تک ایک نئی احساس کے ساتھ وارد ہوئے ہیں۔

منظور بسمل اگر چہ غزل کے شاعر ہیں۔ لیکن انہوں نے چند ایک اچھی نظمیں بھی تخلیق کی ہیں۔ اور بلاشبہ ان کی آواز اپنے عہد کے شعراء سے بہت حد تک مختلف لب ولہجہ کا آئینہ دار ہے۔

اسی طرح جمعدار امیر احمد بزدار بلوچی نظم میں ایک نئی آواز ہیں۔ ان کی شاعری میں سیاسی اور سماجی موضوعات کے حوالے سے ایک گہرا شعور اور ادراک ملتا ہے۔ ان کا شاعرانہ وژن اور ان کی تخلیقی بصیرت نہایت ہی وسیع اور گہرا ہے۔

جمعدار امیر احمد بزدار کے موضوعات میں سیاسی سماجی اور مذہبی رہنماؤں کی منافقت، ریاکاری نااہلی اور عوام کی سادہ لوحی اور بے وقوفی وکم عقلی پر تاسف کے ساتھ ساتھ شدید طنز بھی ملتا ہے۔ وہ مذہبی متعلقات کے ضمن میں انسانی رویوں اور سماجی معاملات کو اہم اور ضروری گردانتے ہیں۔ ان کے نزدیک مذہب صرف عبادت

کا نام نہیں بلکہ یہ اعلیٰ وارفع اخلاقی قدروں اور سماجی معاملات سے جڑا ہوا ایک ایسا نظام فکر ہے۔ جس میں انسان اور انسانیت کو بنیادی حیثیت و اہمیت حاصل ہے۔

چراگ لاشاری مرحوم بلوچی زبان کے باصلاحیت اور ابھرتے ہوئے نوجوان شاعر تھے، وہ اپنی تخلیقی سفر میں ابھی تک نئے تجربوں سے گذر رہے تھے۔ کہ ان کی بے وقت موت نے انہیں ہم سے چھین لیا اور یوں بلوچی ادب ان کی تخلیقی صلاحیتوں سے مکمل طور پر بہرآور نہ ہو سکا۔

نظم کے حوالے سے اگر چہ شامیر ایک نیا نام ہے۔ اور اب تک ان کی صرف چند ہی نظمیں شائع ہو سکی ہیں۔ لیکن ان کی چونکا دینے والی آواز اور ان کا منفرد لب ولہجہ اور ان کی فکری وفنی پختگی بلوچی نظم میں ایک نیا ذائقہ ہی نہیں بلکہ ایک نیا رویہ اور ایک نئے رجحان کی دلالت بھی کرتی ہے۔

اگر چہ بظاہر ان کی نظمیں ان کے شخصی احساسات اور ان کی ذاتی مفہوم کے گرد رومان کا ہالہ بنتی نظر آتی ہیں۔ لیکن ان کے اس ذاتی اور شخصی مفہوم کے بنت میں سماج کا غم بڑی شدت کے ساتھ نمایاں ہے۔ یا دوسرے لفظوں میں یوں بھی کہا جا سکتا ہے۔ کہ ان کا ذاتی دُکھ اور اجتماع کا کرب مل کر ہی ان کی نظم کی تشکیل کرتے ہیں۔ دوسری طرف ان کی نظم کا پیرایہ اظہار التجائیہ لفظوں، عاجزانہ دعاؤں نیک تمناؤں اور وصل کے ناکام اور ناتمام آرزوؤں، خواہشوں، ملتجیانہ نگاہوں اور سوالی ہاتھوں کے برعکس ایک پختہ فکر وشعور کی نمائندگی کرتا ہوا نظر آتا ہے۔

اس ضمن میں Matter can not be destroyed، زور آور

time and space اور omnipresence جیسی نظمیں مثال کے طور پر پیش کی جاسکتی ہیں۔

سلام چاکری ڈیرہ غازی خان کے بلوچ قبائلی علاقہ کوہ سلیمان سے تعلق رکھنے والے نوجوان شاعر ہیں۔ وہ غزل اور نظم ہر دو اصناف میں شاعری کرتے ہیں۔ان کی نظمیں اور غزلیں نئے لب ولہجہ کی آئینہ دار ہیں۔تخلیقی کرب اور فنی بصیرت ان کے فن کا خاصہ ہے۔ان سے یہ توقع کی جاسکتی ہے۔کہ وہ اپنے لئے کوئی نئی راہ ڈھونڈنے میں کامیاب ہوسکتے ہیں۔

نوے کی دہائی کی ابتدا سے لیکر بیسویں صدی کے اختتام تک کے ان دس سالوں میں نئی نسل کے شعرا کی تعداد میں ایک قابل قدر اضافہ دیکھنے میں ملتا ہے۔اس اضافہ کا اندازہ صرف اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ۱۹۹۴ء سے لے کر ۲۰۰۰ء تک چودہ ۱۴۰۰ سو شعرا کا کلام مختلف بلوچی رسائل و جرائد کی زنیت بنا ہے۔(۲۹) لیکن اس غیر معمولی اضافہ کے برعکس چند ایک کو چھوڑ کر نئی نسل کے شعرا میں کوئی بڑا شاعر سامنے نہ آسکا۔گوکہ بعض شعرا نئے تجربے کرنے کی کوششوں میں مصروف ہیں لیکن وہ اپنے لیے کوئی واضح راستہ تلاش کرنے میں ناکام نظر آتے ہیں۔ایک طرف ان شعرا کا لہجہ ناقص اور تجربہ ناپختہ ہے تو دوسری طرف ان میں تخلیقی بصیرت اور آگہی کا فقدان بھی ہے۔

اس صورتحال کی بڑی وجہ غالباً یہی ہوسکتی ہے کہ آجکل بلوچی ادب میں کوئی بڑی تخلیقی تحریک موجود نہیں ہے اور ہمارا معاشرہ، معاشرتی، سماجی، ذہنی اور نفسیاتی سطح پر سراسیمگی، بے یقینی، بے بسی، مایوسی اور شکست پسندی کا شکار نظر آتا ہے۔

جدید بلوچ شعراء کے ہاں کوئی واضح تصور اور کوئی واضح نظریہ نہ ہونیکے باعث ادب میں لایعنیت ،لامرکزیت اور بے مقصدیت کا زہر سرایت کرتا جارہا ہے، جس سے بلوچی ادب اور کلچر مائل بہ مرگ نظر آتا ہے، اور دوسری طرف نئی نسل کے شعراء جس طرح سے نئی شاعری کے اسلوب کو برت رہے ہیں وہ ایک اعتبار سے کلیشے کی شکل اختیار کررہا ہے۔ایک ہی طرح کے تجربات وواردات کی تکرار سے نئی شاعری کا پھیلاؤ بہت حد تک ٹھہراؤ اور جمود کا شکار نظر آتا ہے۔

کیونکہ زندگی میں نظریات اور عصری حقائق اور تقاضے بدلتے رہتے ہیں۔ کسی ادب کا صرف اس لئے زیادہ عرصہ تک زندہ رہنا نہایت ہی مشکل امر ہے کہ اس میں کسی عظیم نظریہ یا روح عصر کو کامیابی سے پیش کیا گیا ہے۔ادب کی دوامیت ، جاودانیت اور ابدیت کے لئے ضروری ہے کہ اس میں فکر کی گیرائی اور گہرائی کے ساتھ ادبی صفات اور عصری رجحانات ومیلانات کی عکاسی پورے خلوص ، دیانت اور فنی مہارت سے کی گئی ہو۔

حوالہ جات

۱۔ عقیل احمد صدیقی، جدید اردو نظم۔۔نظریہ و عمل، علی گڑھ، ایجوکیشنل بک ہاؤس ۱۹۹۰ء ص ۱۷۶

۲۔ سید فیاض محمود، (مدیر خصوصی) تاریخ ادبیات مسلمانان پاک و ہند (جلد چہارم) لاہور، پنجاب یونیورسٹی ۱۹۷۱ء ص ۶۹

۳۔ سید فیاض محمود، (مدیر خصوصی) تاریخ ادبیات مسلمانان پاک و ہند (جلد چہارم) ص ۶۹

۴۔ شیر محمد مری، کہنیں شاحری، کوئٹہ، بلوچی اکیڈمی ۱۹۷۰ء ص ۶۰

۵۔ شیر محمد مری، کہنیں شاحری، ص ۷۵

۶۔ ۔۔۔۔۔ایضاً۔۔۔۔۔ ص ۷۸

۷۔ ۔۔۔۔۔ایضاً۔۔۔۔۔ ص ۱۱۶، ۱۱۷

۸۔ M. Sardar Khan Baloch, Literary History of the Balochis (Vol:1) Quetta, Balochi Academy, 1974, P.P. 229, 230.

۹۔ شیر محمد مری، کہنیں شاحری، کوئٹہ، بلوچی اکیڈمی ۱۹۷۰ء ص ۱۴۹

۱۰۔ شیر محمد مری، کہنیں شاحری، ص ۱۸۶

۱۱۔ ۔۔۔۔۔ایضاً۔۔۔۔۔ ص ۶۱

۱۲۔ ۔۔۔۔۔ایضاً۔۔۔۔۔ ص ۴۰

۱۳۔ جسٹس خدا بخش مری، قدیم بلوچی شاعری (بار دوئم) کراچی، ۱۹۷۶ء ص ۱۱۱، ۱۱۲

۱۴۔ M. Sardar Khan Baloch, Literary History of the Balochis (Vol: 11) Quetta, Balochi, Acdemy 1984 PP 60, 61.

۱۵۔ عبداللہ جان جمالدینی ،گل خان نصیر کی شاعری ،نور محمد شیخ (مرتب) میر گل خان نصیر: شخصیت، شاعری اور سیاست، کراچی عوای ادبی انجمن، ۱۹۹۳ء ص ۲۵

۱۶۔ عبداللہ جان جمالدینی ،گل خان نصیر کی شاعری، نور محمد شیخ (مرتب) میر گل خان نصیر، شخصیت، شاعری اور سیاست ص ۴۵

۱۷۔ ڈاکٹر شاہ محمد مری، بلوچ قوم۔۔قدیم عہد سے عصر حاضر تک، لاہور، تخلیقات ۲۰۰۰ء ص ۳۱۴

۱۸۔ ڈاکٹر شاہ محمد مری، بلوچ قوم۔۔قدیم عہد سے عصر حاضر تک، ص ۳۱۳

۱۹۔ خلیل الرحمٰن اعظمی، اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک، علی گڑھ، ایجوکیشنل بک ہاؤس ۱۹۷۹ء ص ۳۱

۲۰۔ غوث بخش صابر، بلوچی ادب، اسلام آباد، اکادمی ادبیات پاکستان ۱۹۹۹ء ص ۱۰۲

۲۱۔ کریم دشتی، شرگداری، کوئٹہ زمانہ پرنٹنگ پریس ۱۹۶۳ء ص ۳۷

۲۲۔ غوث بخش صابر، بلوچی ادب، اسلام آباد، اکادمی ادبیات پاکستان ۱۹۹۹ء ص ۱۰۲

۲۳۔ غلام فاروق بلوچ، نوکیں تام، کراچی، بلوچی لنبرانکی دیوان ۱۹۸۵ء ص ۸۰

۲۴۔ واحد بزدار، شاہیم، کوئٹہ، بلوچی اکیڈمی ۱۹۹۸ء ص ۲۲۰ ، ۲۲۱

۲۵۔ غلام فاروق بلوچ، نوکیں تام، کراچی، بلوچی لنبرانکی دیوان ۱۹۸۵ء ص ۱۲۹

۲۶۔ غلام فاروق بلوچ، نوکیں تام، ص ۱۳۸

۲۷۔ محمد بیگ بیگل (پیش گال) جابار، شوہاز بلوچ، مسقط، بلوچ سنگت ادبی مجلس ۲۰۰۰ء ص ۱۹

۲۸۔ غلام فاروق بلوچ، نوکیں تام، کراچی، بلوچی لنبرانکی دیوان ۱۹۸۵ء ئص ۱۹۸

۲۹۔ یہ معلومات پروفیسر صبا دشتیاری سے حاصل کی گئیں جو اس ضمن میں تحقیقی کام کر رہے ہیں۔

☆☆☆☆

بلوچی غزل۔تاریخ وارتقاء

بلوچی غزل۔۔۔۔تاریخ وارتقاء

نظم کے برعکس غزل کی روایت بلوچی شاعری میں موجود نہیں تھی۔ بلوچی ادب میں سب سے پہلے ایک مستعار صنف کی حیثیت سے غزل کی بنیاد رکھنے کی غیر شعوری کوشش کا سہرا ملنگ شاہ ہاشمی کے سر جاتا ہے۔ جنہوں نے ۱۹۲۲ء کے لگ بھگ غزل میں طبع آزمائی کی۔ گوکہ ملنگ شاہ ہاشمی کی شاعری کا بیشتر حصہ محفوظ نہ ہونے کی باعث امتدادِ زمانہ کی نذر ہوگیا۔ مگر وہ بجا طور پر بلوچی غزل کے پہلے شاعر ہیں۔ جنہوں نے بلوچی ادب وسخن میں پہلی بار غزل کو نہ صرف متعارف کرایا بلکہ بلوچی شاعری میں غزل کی جڑوں کو پیوست کرنے میں بنیادی کردار ادا کیا۔

غزل کے آغاز وارتقاء کے حوالے سے سید ظہور شاہ ہاشمی ''بلوچی زبان و ادب کی تاریخ'' میں لکھتے ہیں کہ ''جدید بلوچی شعری ادب کا آغاز ۲۲-۱۹۲۳ء میلادی کے لگ بھگ ہوا ہے۔ لوگوں کو اس میں ضرور مبالغہ سا نظر آئے گا اس کا محرک چاہے کچھ بھی ہو مگر زبان کی خدمت کا جذبہ بالکل سچا نہ تھا۔ سب سے پہلے یہ حقیقت تسلیم شدہ ہے کہ جدید بلوچی شعری ادب کا غزل گوئی سے آغاز ہوا ہے۔ حالانکہ یہ بھی تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ یہ صنف سخن اس سے پہلے بلوچی زبان میں بالکل ناپید تھی۔ اور سب سے پہلے غزل کا آغاز کراچی کے ملنگ بابا (ملنگ شاہ ہاشمی وفات ۱۳۴۴ھ) نے کیا۔ ملنگ بابا سے پہلے بلوچی زبان میں کسی نے غزل کہی ہے ہم نے کبھی سنا ہے اور نہ ہی کلام دیکھا ہے۔

بالضبط تو یہ کہنا ذرا مشکل ہے کہ بابا مذکور نے کتنی عمر اور کس سن و سال میں پہلی غزل کہی ہے۔ لیکن ہماری تحقیق کے مطابق اس نے کوئی ۱۸ سال کی عمر میں تقریباً ۱۹۲۲ء میں اپنی غزل گوئی کا آغاز کیا ہے۔''(۱)

غزل کی ابتداء کے حوالے سے سید ظہور شاہ ہاشمی کی بات تو درست ہے لیکن غزل کو جدید بلوچی شاعری کی ابتداء قرار دینا شاید درست نہ ہو۔ کیونکہ جدید بلوچی شاعری اگر جدید افکار و خیالات کا نام ہے تو ملنگ شاہ ہاشمی کی غزل گوئی اس کسوٹی پر پورا نہیں ترتی۔ کیونکہ نئی شاعری نئے شعور سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ شعور ہیئت اور مواد دونوں اعتبار سے ایک نئے نظام سے متعلق ہوتی ہے اور یہ مواد خارجی زندگی سے حاصل ہوتا ہے۔

اگر دوسری طرف صرف صنف کے حوالے سے بھی بات کی جائے تو بھی غزل کے مقابلے میں نظم کی روایت صدیوں پرانی ہے۔ لیکن اس کے باوجود ہم اسے جدید نظم قرار دے نہیں سکتے کہ اس میں کوئی فنی اپج، معنوی تازگی اور عصری آگہی نہیں ملتی۔ اس لئے صرف قیام پاکستان سے چند سال پہلے کے عرصہ میں غزل اور نظم کو سالوں کے خانوں میں بانٹنے سے جدید بلوچی شاعری کے جدید مفہوم اور نئی معنویت کو واضح نہیں کیا جا سکتا۔

جدید بلوچی شاعری تو اصل میں وہ جدید حسیت کا اظہار ہے جو بیسویں صدی کی تیسری اور چوتھی دہائی میں وطن دوستی اور آزادی کی تحریک کے نتیجے میں ایک نیا اور توانا رویہ بن کر سامنے آیا تھا۔ اور یہی نیا رویہ اور نئی سوچ و شعور کا اظہار ہمیں

غزل کی بجائے بلوچی نظم میں ملتا ہے اور یوں غزل کے برعکس جدید نظم ہی کو جدید بلوچی شاعری کا نقطۂ آغاز قرار دیا جاسکتا ہے۔

اس کے ساتھ دوسری طرف ملنگ شاہ ہاشمی کی رجحان ساز کردار سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جنہوں نے پہلی بار بلوچی ادب میں غزل کی بنا ڈالنے میں بنیادی کردار ادا کیا۔ بلوچی میں شاعری کرنے سے پہلے ملنگ شاہ ہاشمی اردو میں شاعری کرتے تھے۔'' ان کے بارے میں یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ وہ اپنی تخلیقی سفر کی ابتداء میں ہندوستان کے اردو شعراء سے متاثر تھے۔ اور انہوں نے انہی سے شعر گوئی کے بارے میں جان کاری حاصل کی تاہم یہ معلوم نہ ہوسکا کہ انہوں نے کس شعراء سے فیض حاصل کی۔ کہتے ہیں کہ بمبئی کے سیاحت کے دوران ظفر نامی اردو شاعر سے ان کی ملاقات ہوئی اور انہوں نے اپنی اردو شاعری کے بارے میں ان سے اصلاح و مشورہ لی تو اس شاعر نے ان کو اردو کے ساتھ ان کی مادری زبان بلوچی میں شاعری کرنے کا مشورہ دیا تا کہ وہ اپنے خیالات واحساسات کا اظہار بہتر انداز میں کر سکے۔

انہی کے تحریک کے باعث ملنگ شاہ ہاشمی نے اپنی توجہ بلوچی شاعری کی طرف مرکوز کی اور انہوں نے بلوچی شاعری میں مختلف تجربے کیئے اور زیادہ تر ان کی فنی مہارت اور تجربوں کا اظہار ان کی غزل میں نمایاں نظر آتا ہے۔'' (۲)

ملنگ شاہ ہاشمی کی غزلیات کا کوئی تحریری نمونہ تو دستیاب نہ ہوسکا۔ لیکن سینہ بہ سینہ منتقل ہونے والی ان کی شاعری سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ ان کی غزل میں تصوف کے مسائل اور اسرار و رموز کا عمل دخل زیادہ نمایاں اور گہرا ہے۔'' (۳) جبکہ

دوسری طرف ان کی غزلوں میں اُردو، ھندی اور سندھی الفاظ وتراکیب کا استعمال بھی نمایاں ہے۔اس ضمن میں پروفیسر صبا دشتیاری کا خیال ہے کہ ان کی شاعری میں مذکورہ زبانوں کے الفاظ وتراکیب کا عمل دخل مرور ایام کے باعث ہی ممکن ہوسکا ہے۔ کیونکہ ''ان کی شاعری کو سینہ بہ سینہ منتقل کرنے اور یاد رکھنے والے ان کے مریدین ہی تھے۔جنہوں نے اپنے طور پر تحریف وتصریفات سے کام لے کر ان کی شاعری کے اصل متن کو مسخ کر کے رکھ دیا۔''(۴)

سید ملنگ شاہ ہاشمی کے بعد بلوچی غزل کی تاریخ میں جلال پکیر کا نام آتا ہے اور اس کا عہد بھی کم وبیش یہی ہے۔''جلال پکیر کی کچھ غزلیں ھمیں گویوں کے توسط سے سننے میں آئی ہیں۔تحقیق کے بعد یہ بات بھی سامنے آئی ہے کہ ان کی شاعری کا ایک دیوان قلمی نسخے کی صورت میں ان کے چھوٹے بھائی کے پاس محفوظ ہے جو عرصہ دراز سے ایران میں مقیم ہیں۔جلال پکیر کے علاوہ بھی اس عہد میں کچھ اور غزل گو بھی رہے ہیں۔لیکن ان کی شاعری زمانے کی دست برد سے محفوظ نہ رہ سکی۔''(۵)

بلوچی ادب کے میدان میں غزل کی اس ابتدائی پیش رفت کی اہمیت اپنی جگہ مسلم سہی لیکن بلوچی غزل کے آغاز وارتقاء کا حقیقی دور پچاس کی دہائی کے ابتدائی سالوں کا وہ زمانہ ہے۔جہاں ریڈیو پاکستان کے علاقائی پروگراموں کے سمیت مختلف بلوچی ادبی جریدوں کی اشاعت کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔

اس دہائی میں بلوچی زبان میں تحریری ادب کا آغاز ہوا۔اور ۱۹۵۱ء میں مولانا خیر محمد ندوی مرحوم کی ادارت میں بلوچی زبان کا پہلا ادبی مجلّہ ''اومان'' کا اجرا ہو

ا۔اوراسی دہائی ہی میں مختلف ادبی اداروں اور تنظیموں کے قیام سے بلوچی ادب میں ایک پھیلاؤ اور وسعت دیکھنے میں آتی ہے۔ادبی اداروں اور تنظیموں کی سرگرمیوں کے باعث بہت سے پڑھے لکھے بلوچوں کی توجہ بلوچی ادب کی طرف مبذول ہوئی جس سے بلوچی ادیبوں اور شاعروں کی اکثریت نے مل کر ایک کارواں کی صورت اختیار کر لی۔

۱۹۵۱ء میں بلوچی زباں کے نامور شاعر میر گل خان نصیر کی شاعری کا پہلا مجموعہ ''گلبانگ'' منظر عام پر آیا۔اس میں ان کی نظموں کے علاوہ کچھ غزلیں بھی شامل تھیں۔لیکن انہوں نے جلد ہی غزل کو خیر باد کہہ کر مکمل طور پر نظم کو اظہار کا وسیلہ بنالیا۔کیونکہ غزل کے مقابلے میں نظم میں مقصدیت کی زیادہ گنجائش او روسعت موجود تھی۔اس لیے انہوں نے اپنے اظہار کے لیے شعوری طور پر نظم کو زیادہ اہمیت دی۔

آزادی کے بعد جن شاعروں نے نام پیدا کیا۔وہ بھی نظم کے شاعر تھے۔اوران کا واضح رجحان ادب برائے زندگی تھا۔انہوں نے شعوری طور پر سیاسی اور سماجی مسائل کو اپنی تخلیقات میں جگہ دی۔بلوچی ادب کے اس ابتدائی دور میں ادب کو تاریخی، معاشی، سیاسی اور سماجی حوالوں سے دیکھنے کے باعث بلوچ شعراء کے ہاں جذبات سے زیادہ خیالات وافکار اور ہئیت سے زیادہ مواد کو اہمیت ملی۔

سیاسی اور سماجی تصورات کے زیر اثر میر گل خان نصیر نے ہی سب سے پہلے اپنی تخلیقات میں اپنے عہد کے مسائل کا اظہار کیا اور پہلی بار انہوں نے بلوچی شاعری

میں جنگ اور انقلاب کا نعرہ بلند کیا۔

میر گل خان نصیر سے متاثر ہونے کے باعث محمد حسین عنقا نے بھی اردو میں شاعری کرنے کی بجائے بلوچی زبان کو ترجیح دی۔ محمد حسین عنقا نے نظم کے ساتھ ساتھ غزلیں بھی لکھیں۔ ان کی غزلیں ابتدائی دور کے دوسرے شعراء سے کہیں زیادہ فنی پختگی اور تاریخی شعور کے حامل ہیں۔ بلوچی شاعری کی طرف راغب ہونے سے پہلے وہ اردو اور فارسی میں شاعری کرتے تھے۔ ''۱۹۳۳ء میں فارسی اور اُردو شاعری پر مشتمل ان کا ایک مجموعہ کلام ''رحیل کوہ'' کے نام سے منظر عام پر آ چکا تھا'' (۴)

فارسی اور اُردو ادب کے ادبی رجحانات و میلانات سے واقفیت اور آگہی رکھنے کے باعث ان کی بلوچی شاعری میں تخلیقی پختگی اور فنی مہارت نظر آتی ہے۔ دوسری طرف ان کی غزلوں اور نظموں میں سیاسی اور سماجی مسائل کو دوٹوک انداز میں بیان کرنے کی بجائے استعاراتی اور علامتی زبان استعمال کیا گیا ہے جو ان کی فنی بصیرت اور تخلیقی آگہی کی دلالت کرتی ہے۔

غزل کی اس ابتدائی دور میں عبدالحکیم حقگو مولانا عبدالغنی منیب دوست محمد بیکس انور شاہ قحطانی اسحٰق شمیم ملا اسماعیل پھل آبادی آدم حقانی، سید ظہور شاہ ہاشمی ،قاضی عبدالرحیم صابر، محمد حسین عاجز، مراد ساحر، احمد زہیر، احمد جگر، ملک محمد رمضان ،میر عیسےٰ قومی، عنایت اللہ قومی اور بہت سے دوسرے شعراء کے نام سامنے آتے ہیں لیکن غزل کی اس ابتدائی سطح پر چند ایک کو چھوڑ کر بیشتر شاعروں کے ہاں غزل کا روایتی مزاج ہی کارفرما نظر آتا ہے۔

اُردو اور فارسی کے روایتی تشبیہات اور استعارات اور تلمیحات ولفظیات کے استعمال سمیت فکر وخیال میں بھی سطحیت اور یکسانیت نمایاں ہے۔ مگر بعد کے آنے والے ادوار میں صورتحال اس سے یکسر مختلف نظر آتی ہے۔ کیونکہ وطن پرستی جیسے رجحان ومیلانات اور معاشرتی تبدیلیوں کے حوالے سے ایک نیا رویہ سامنے آ رہا تھا۔ جس کی وجہ سے غزل کا رخ روایتی موضوعات کے برعکس نئے تقاضوں نئے رویوں اور جدید فکر کی طرف راغب ہوا۔ اس لئے بہت سے شعراء نے خود کو فارسی اور اردو کے اثرات سے بچا کر نہ صرف بلوچی شعری لہجہ اختیار کیا۔ بلکہ فکری سطح پر بھی غزل کے ماورائی جذبہ سے دامن چھڑا کر عصری مسائل کے اظہار کو اپنے فن کا وسیلہ بنالیا۔ اس طرح بہت سے شاعر جن کی ابتداء میں رویہ روایتی تھا۔ لیکن معاشرتی تبدیلیوں کے باعث وہ بتدریج جدید آگہی اور تجربوں کی جانب بڑھتے گئے۔

خاص طور پر ایسے شعراء میں سے میر عیسیٰ قومی، عنایت اللہ قومی اور آدم حقانی کے نام نمایاں ہیں۔ جنہوں نے وقت کے گذرنے کے ساتھ ساتھ نئے رجحانات و میلانات کو بدلتی تقاضوں کا حصہ سمجھ کر انہیں اپنی شاعری میں برتنا شروع کیا۔

میر عیسیٰ قومی کی شروع کی شاعری میں ان کے یہاں موضوعات جدید ہونے کے باوجود ان کا طرز احساس روایتی ہی تھا لیکن بعد میں ذہنی وفکری ارتقاء کے باعث ان کی شاعری میں نیا رنگ آتا گیا۔ یہ نیا رنگ اور نیا ذائقہ ان کے شعری مجموعوں ''گلدستہِ قومی ۱۹۸۴ء'' اور ''گل بہار ۱۹۸۸ء'' میں بخوبی دیکھا جاسکتا ہے۔

میر عیسیٰ قومی کی طرح عنایت اللہ قومی بھی اپنی تخلیقی سفر میں ذہنی وفکری ارتقاء

کے مراحل سے گذرنے کے بعد اپنے لئے ایک الگ لہجہ اپنانے میں کامیاب نظر آتے ہیں۔ اوران کے تینوں مجموعوں ''زردءِ اومان ۱۹۸۵ء''، ''دل ءِ توار ۱۹۹۰ء'' اور ''جگرءِ کپوت ۲۰۰۰ء'' ان کی تخلیقی ارتقاء کی نشاندہی کرتے ہیں۔ اوران کا کمال یہ بھی ہے کہ ''وہ پچاس کی دہائی سے لے کر اب تک بلوچی ادب سے وابستہ نظر آتے ہیں۔ جبکہ جدید بلوچی شاعری کے سفر میں نہ جانے کتنے شاعر تھک ہار کر خاموش ہو گئے۔ لیکن قومی پیرانہ سالی کے باوجود تخلیقی عمل میں برابر منہمک نظر آتے ہیں۔'' (۷)

آدم حقانی جنہوں نے غزلیں بھی لکھیں اور نظمیں بھی تحریر کیں اور ابتدائی دور کے مقابلے میں ان کے بعد کی شاعری میں ذہنی اور فنی پختگی کا سفر نمایاں اور گہرا ہے۔ آدم حقانی نے اپنی شاعری میں جہاں ایک طرف محنت کشوں، کسانوں اور مزدوروں کے مسائل کو زیادہ اہمیت دی تو دوسری طرف انہوں نے سرداروں، نوابوں اور جاگیرداروں کی طبقاتی جبر اور استحصال کے خلاف آواز بلند کی۔

احمد زہیر اور احمد جگر بھی ابتداء میں غزل کی روایتی مزاج کے اسیر رہے تاہم وہ مکمل طور پر غزل کی مبہم رومانیت، غم، مایوسی، ملال اور افسردگی کی فضاء سے اپنا دامن چھڑا نہ سکے۔

احمد زہیر بنیادی طور پر ایک روایت پسند شاعر ہیں۔ انہوں نے اپنے عہد کے انسانی اور سماجی تقاضوں کی طرف توجہ نہیں دی اور نہ ہی ان کے ہاں عالمی احساس کارفرما نظر آتا ہے۔ اسی وجہ سے وہ اپنے عہد کے کارواں سے الگ تھلگ اپنی ذات کی پر پیچ راہوں پہ گامزن دکھائی دیتا ہے۔'' (۸)

قاضی عبدالرحیم صابر اور محمد حسین عاجز کی غزلوں میں غزل کی روایتی مزاج کے علاوہ تصوف کا رنگ بھی نمایاں ہے۔ لیکن غزل کی نسبت ان دونوں کا رجحان نظم کی طرف رہا۔ گوکہ ابتدائی دور میں انہوں نے غزلیں بھی لکھیں۔ لیکن بنیادی طور پر یہ دونوں نظم کے شاعر ہیں۔ اور انہوں نے نظم کے میدان میں اپنے خیالات کا اظہار نسبتاً بہتر انداز میں کیا ہے۔

بلوچی غزل کی ابتدائی سفر غزل کی عمومی رویہ و مزاج سے ہی عبارت نظر آتی ہے۔ کیونکہ بلوچ شعراء کے سامنے اردو اور فارسی غزل کی عمومی رومانوی روایت اور تصور موجود تھی۔ جبکہ اسی دور میں دوسری طرف وطن دوستی، قوم دوستی اور سماجی شعور و انقلاب جیسے تصورات کے زیر اثر ادب میں مقصدیت کے واضح رجحان سمیت صداقت اور دیانت پر مبنی بلوچی ادب کی اپنی دیرینہ شعری روایت بھی تھی۔

گوکہ بلوچ غزل گو شعراء نے شروع میں دیکھا دیکھی کے باعث غزل کی مروج رجحان کی پیروی کی لیکن بعد میں انہوں نے اس روایتی اسلوب کی پیروی کو ترک کرتے ہوئے غزل میں اک نئے طرز احساس کی بنیاد رکھی۔ سب سے پہلے محمد حسین عنقا، آدم حقانی، ملک محمد رمضان نے بالعموم اور سید ظہور شاہ ہاشمی اور مراد ساحر نے بالخصوص بلوچی غزل میں اس نئے طرز احساس کو متعارف کرانے اور اسے شعوری طور پر پروان چڑھانے میں اجتہادانہ کردار ادا کیا۔ انہوں نے غزل کی روایتی اسلوب و مضامین کے برعکس نہ صرف پہلی بار غزل میں سماجی و معاشرتی مسائل اور عصری شعور کو جگہ دیتے ہوئے اسے بلوچی شاعری کی مزاج و اسلوب سے ہم آہنگ کیا۔ بلکہ فارسی

اور اردو کے علامات، لفظیات وتشبیہات کی بجائے خالص بلوچی الفاظ وتراکیب کو برتتے ہوئے غزل کو مقامیت کے رنگ میں رنگ دیا۔

پروفیسر صبا دشتیاری ''گلکارءِ چکنکار'' میں لکھتے ہیں۔ ''اگر ہم بلوچی شاعری اور خاص طور پر غزل کی تاریخ پر نگاہ ڈالیں تو ہمیں دو (سید ظہور شاہ ہاشمی اور مراد ساحر) ایسے نام ملتے ہیں۔ جنہوں نے پوری ادبی دیانتداری سے غزل کی آبیاری کی۔ اور اسے ایک ایسے مقام پر لا کھڑا کیا۔ جہاں بجا طور پر ہم بڑے فخر کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ بلوچی غزل دنیا کی دوسری زبانوں سے ہرگز کم تر نہیں ہے۔

بلوچی شاعری کے حوالے سے سید ظہور شاہ ہاشمی وہ شخصیت ہیں جسے ہم صحیح معنوں میں غزل کا شاعر کہہ سکتے ہیں۔ اور ان کی غزل کے بارے میں صرف اتنا کچھ کہنا ہی کافی ہے کہ انہوں نے فنی اعتبار سے بلوچی غزل کو ایک کامل صورت عطا کی۔ اور ان کی غزل کی خاصیت یہ ہے کہ انہوں نے نہ صرف غزل کو بلوچی مزاج اور آہنگ عطا کی بلکہ اسے ایک منفرد اسلوب سے بھی ہمکنار کیا۔ اور یہ اسلوب سید ظہور شاہ ہاشمی کے فن کا خاصہ ہی ہوسکتا ہے۔

سید نے شعوری طور پر بلوچی کلاسیکی شاعری کی خصوصیات اور رنگ وآہنگ کو اپنی غزل میں جگہ دی۔ بلوچی شاعری کی شعری مزاج اور روایت کو مدنظر رکھتے ہوئے جدید اور قدیم کی خوبصورت امتزاج سے انہوں نے غزل کو ایک نیا اسلوب اور ایک نیا جہت عطا کیا۔ بلاشبہ سید ظہور شاہ ہاشمی غزل کے پہلے شناور ہیں اور ان کی غزل کی سب سے بڑی خاصیت یہ ہے کہ اس کی غزل کو بجا طور پر بلوچی غزل کہا جاسکتا

ہے۔"(۹)

سید ظہور شاہ ہاشمی کے بعد مراد ساحر غزل کا سب سے بڑا نام ہے۔ جنہوں نے روایتی تشبیہات واستعارات اور مستعار وتقلیدی افکار کے برعکس بلوچی غزل کو نئی تشبیہوں، نفیس بندشوں اور سوچ سے ہمکنار کیا۔ انہوں نے غزل کے حوالے سے ایک نئی شعری زبان اور الفاظ وتراکیب کا ایک نیا(Syntax) وضع کیا۔ جس سے احساسات وجذبات کے نئے دریچے وا ہونے کے ساتھ ساتھ تجربات وواردات کے نئے امکانات سامنے آئے۔

مراد ساحر سے پہلے بلوچی غزل چند مختصر اور محدود تصورات وموضوعات کے گرد گھومتا تھا۔ لیکن یہ مراد ساحر کا کمال ہی ہے کہ انہوں نے پہلی بار غزل کے عمومی مزاج اور روایتی پیراھن کو مسترد کرتے ہوئے اسے نہ صرف مقصدی موضوعات سے آشنا کیا بلکہ اس کے موضوعاتی دائرہ کو وسیع تر کرتے ہوئے اسے ذات سے کائنات تک پھیلا دیا۔

عشق غزل کا مرکزی اور بنیادی موضوع رہا ہے۔ روایتی غزل کے ہاں کبھی یہ عشق محبوب کی کافراداؤں، اس کی رعنائیوں، ہجر کے دکھ اور وصال کی لذت کے گرد احساس کا ہالہ بُنتا رہا۔ کبھی یہ ماورائی جذبہ کے طور پر غزل میں ایک مبہم اور مجرد رومانیت کے تصور میں ڈھلتا رہا۔ لیکن سماجی کشمکش اور زندگی کے شکست وریخت کے نتیجے میں غزل کے عشق کے دائرہ کار میں وسعت آ گئی۔ جس سے محبوب کا تصور بدل گیا۔ اس کے خدوخال بھی بدل گئے۔

اس طرح کہیں یہ تصور لیلائے وطن کے روپ میں ڈھل گیا اور کہیں یہ تصور ایک بہتر اور خوشحال معاشرے کی تخلیق کا آرزو بن گیا۔ بلوچی غزل میں بھی یہ عشق ایک نئی رومانیت اور نئی معنویت میں ڈھلتا ہوا نظر آتا ہے۔ یہ نئی رومانیت دھرتی اور اس کے مظاہر سے شدید وابستگی اور چاہت کا اظہار ہے۔ سب سے پہلے غزل میں اس نئی رومانیت کا اظہار مراد ساحر نے ہی کیا۔ انہوں نے عشق و حسن کے پس منظر میں عصری مسائل اور سماجی کشمکش کو اجاگر کیا۔

پروفیسر صبا دشتیاری ان کی غزل گوئی کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ ''ان کے (مراد ساحر) بارے میں بلا خوف و خطر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کے یہاں سادگی و پرکاری بدرجہ اتم موجود ہے اور یہی چیز ان کی غزل کی روح ہے۔ ان کی زبان سادہ اور سہل ہے اور ان کے فن کا کینوس حیران کن حد تک وسیع اور گہرا ہے۔ جدت پسندی ان کے فن کا خاصہ ہے۔'' (۱۰)

حقیقت یہ ہے کہ مراد ساحر نے ملنگ شاہ ہاشمی سے لے کر عصر حاضر تک کے مختلف ذائقوں اور لہجوں کو سمیٹتے ہوئے بلوچی غزل کو نہ صرف ایک نمایاں اور نئی جہت عطا کی بلکہ ان کے ہاں غزل ایک تاریخی اور فکری موڑ لیتی ہوئی نظر آتی ہے۔

مراد ساحر کی تخلیقی شخصیت کا نمایاں پہلو یہ بھی ہے کہ وہ بیالیس برسوں (۱۹۵۴-۱۹۹۸ء) پر محیط اپنی تخلیقی سفر میں کسی بھی مقام پر جمود اور یکسانیت کے شکار نہیں ہوئے۔ مجموعی طور پر ان کے تین شعری مجموعے ''پاہار ۱۹۷۰ء''، ''چیہال ۱۹۸۷ء'' اور ''زرءِ مروارد ۱۹۹۰ء'' شائع ہوئے۔ مگر اس کا ہر مجموعہ ہی نہیں

بلکہ ان کی ہر غزل اپنے ذائقہ اور لہجے کے اعتبار سے دوسری غزل سے مختلف اور الگ نظر آتی ہے۔

ساٹھ کی دہائی تک کے عرصہ میں گو کہ فکری اور فنی طور پر نظم نے زیادہ ترقی کی۔ کیونکہ غزل کے روایتی اور محدود ہئیت کے مقابلے میں نظم میں اظہار خیال کی زیادہ وسعت اور گنجائش موجود تھی۔ لیکن ساٹھ کی دہائی کے آخری اور ستر کے ابتدائی سالوں میں نظم کے ساتھ ساتھ غزل بھی معاشرتی تبدیلیوں اور فکری کروٹوں کے باعث معاشرتی سطح پر اپنا رابطہ استوار کرنے میں کامیاب رہی۔ جس سے غزل کو ایک نئی توانائی اور تازگی میسر آئی۔

روایتی خیال و مضامین کے برعکس سماجی اور سیاسی موضوعات کو غزل میں جگہ دینے کا جو اجتہادانہ عمل سید ظہور شاہ ہاشمی نے شروع کیا تھا۔ مراد ساحر تک پہنچتے پہنچتے یہ رویہ ایک طاقت ور اور توانا روایت کی صورت اختیار کر گیا۔ اور بعد کے آنے والے شعراء بھی کسی نہ کسی شکل میں اسی توانا روایت کے زیر اثر رہے۔

غزل میں سماجی اور سیاسی موضوعات کے دخیل کا بڑا سبب تو مجموعی طور پر بلوچستان کی وہ سیاسی صورتحال تھی جہاں ایک طرف ون یونٹ اور پھر ۱۹۵۸ء میں مارشل لا کے اثرات نے ادب میں ایک نئی مزاحمتی رویے کو جنم دیا۔ دوسری طرف شروع ہی سے ترقی پسند ادبی تحریک سے متاثر ہونے کے باعث بلوچ اہل قلم کے ہاں روشن خیالی کی فکری تحریک سمیت تاریخی اور طبقاتی شعور کے تصور کو بھی بنیادی اہمیت حاصل رہی۔

ترقی پسند ادبی تحریک کے اثرات اور جدید عصری حقائق سے آگہی کے سبب بلوچ شعراء کے تصور حیات اور تخلیقی شعور اور صلاحیتوں میں بڑی کشادگی اور وسعت پیدا ہوئی۔ جس سے بلوچی شاعری کا رخ کائنات میں بنیادی صداقتوں اور سچائیوں کی تلاش کے عمل کے سمیت عالمگیر سوچ کی طرف مڑ گیا۔

انہوں نے ایک خاص خطہ زمین کے حوالے سے اپنی پہچان کرانے اور اپنی زبان، تاریخ وتہذیب کی بازیافت کے عمل کے ساتھ ساتھ عالمگیر انسانیت کے تصور کو بھی اپنی تخلیقات کا حصہ بنایا۔ جس سے ان کے اظہار میں ایک گہرائی اور گیرائی پیدا ہوئی اور ان کے بعد کی نئی نسل کے شعراء نے بھی اس عالمی اجتماعی احساس کو اپنے فن کا مینی فیسٹو قرار دیا۔

ترقی پسند ادبی تحریک کی فکری معنویت اور خارجی دباؤ کے اثرات کے باوجود عطا شاد کی غزل کا لہجہ اپنے عہد کے دوسری آوازوں سے مختلف نظر آتا ہے۔ گوکہ عطا شاد بنیادی طور پر نظم کے شاعر ہیں۔ لیکن نظم کے ساتھ ساتھ وہ غزل بھی لکھتے رہے۔ اور ان کے نظم ہی کی طرح غزل میں بھی سیاسی صورتحال کی براہ راست عکاسی نہیں ملتی۔ کیونکہ دوٹوک سماجی حقیقت نگاری کے برعکس وہ واقعات کی سطح سے بلند ہو کر زندگی اور اس کے متعلقات کو فن میں برتنے کے قائل تھے۔

دوسری طرف عطا شاد کی غزلیں اور نظمیں فنی اور تخلیقی سطح پر ایک دوسرے سے علیحدہ اور مختلف مزاج بھی رکھتی ہیں۔ ان کے نظموں میں جو پراسراریت، گھمبیرتا اور مخصوص خوابناک احساساتی فضا ملتا ہے۔ وہ ان کی غزل میں دکھائی نہیں

دیتا بلکہ ان کی غزل میں صورتحال نسبتا واضح دکھائی دیتا ہے۔

ژونگ کے الفاظ میں یہ کہا جاسکتا ہے۔ کہ عطا شاد کی غزل کا مواد انسانی شعور کی دنیا سے ترتیب پا کر عام انسانی تجربہ سے ذرا بلند ہو کر شعری تجربہ میں ڈھلتا ہے۔ جبکہ ان کی نظم کا مواد انسانی ذہن کے ان گوشوں سے مہیا ہوتا ہے جنہیں با آسانی سمجھنا ممکن نہیں ہے۔

عطا شاد کے ہاں بھی غزل ایک خاص طرح کی رومانی فضا سے دوچار نظر آتی ہے۔ اس رومانی فضا میں عطا شاد کی بے سروسامانی جو اصل میں ان کے عہد کی بے سروسامانی ہے۔ نمایاں ہے۔ عطا شاد کے ہاں اپنے عہد کا غم بھی عشق و محبت کے شخصی اظہار میں ڈھل کر سامنے آتا ہے۔ عطا شاد نے اپنے عہد کے آشوب کو اپنے داخلی وجود کی گہرائیوں میں اُتار کر اسے ایک نئی معنویت اور نئی جہت دینے کی کوشش کی ہے۔

کریم دشتی بنیادی طور پر ایک معروف نقاد کی حیثیت سے بلوچی ادب میں اپنی پہچان رکھتے ہیں۔ لیکن انہوں نے تنقید نگاری سمیت شاعری بھی کی۔ ان کے ہاں روایت اور جدت کی خوبصورت امتزاج کے علاوہ فکر وخیال کی گہرائی اور اچھوتا پن نمایاں ہے۔ انگریزی، عربی، فارسی، اُردو اور بلوچی ادب پر دسترس رکھنے اور ایک نقاد کی حیثیت سے انکی غزلوں میں دانش حاضر کی جھلک اور تنقیدی بصیرت ایک زیریں لہر کے طور پر نمایاں دکھائی دیتا ہے۔

پروفیسر صبا دشتیاری ان کے فن کے بارے میں لکھتے ہیں کہ ''داخلیت اور

رمزیت غزل کے بنیادی اور لازمی عناصر شمار ہوتے ہیں اگر ہم کریم دشتی کی غزل پر نگاہ ڈالیں تو ان کے ہاں یہ دونوں چیزیں فنی پختگی کے ساتھ نمایاں ہیں۔''(۱۱) اس کے ساتھ ان کی غزلوں میں بہت سی ایسی علامات دیکھنے میں ملتی ہیں کہ ''وہ تاریخی اور روایتی ہونے کے باجود اپنے اندر ایک نئی معنویت اور جدت رکھتی ہیں۔اور یہی چیز کریم دشتی کے غزل کو منفرد مقام عطا کرنے کا سبب بنی۔''(۱۲)

ساٹھ کی دہائی کے آخری سالوں اور ستر کی دہائی میں غزل کے حوالے سے ظفر علی ظفر، جی۔آر۔ملا، بشیر بیدار، الفت نسیم، ابراہیم عابد، مومن بزدار، غوث بخش صابر، بانل دشتیاری، اسماعیل ممتاز، پیر بخش پیرل، برکت اللہ بلوچ، غلام فاروق، انور صاحب خان، رزاق نادر، صوفی اسحٰق ساجد بزدار، غلام حسین شوہاز، اقبال راز، تاج محمد طائر اور بہت سے دوسرے شعراء کے نام سامنے آتے ہیں۔جنہوں نے غزل کے موضوعاتی دائرہ کو وسیع کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔

مجموعی طور پر ''رومان'' ان شعراء کے غزل کا بنیادی موضوع ہے لیکن اس رومان میں جہاں انفرادی اور ذاتی محسوسات کے حوالے سے محبوب کی کا فراداؤں ،رعنائیوں، حسن کی کارفرمائیوں، بے وفائیوں، وصال کی لذتوں اور ہجر کی تلخیوں کا اظہار ملتا ہے تو دوسری طرف وہیں پہ یہ رومان وطن اور اس کے جنم زادوں کی محبت میں ڈھلتا ہو نظر آتا ہے۔

اس طرح ان کی غزل بیک وقت غم محبوب اور غم وطن کی شاعری ہے۔جہاں انفرادی محبت کا اظہار بھی ہے اور اجتماع کے درد کی عکاسی بھی۔یوں انفرادی اور

اجتماعی دونوں کیفیات کے اظہار کے سبب ان کے غزل میں ایک وسعت اور تنوع نظر آتی ہے کیونکہ ''تیسری دنیا کا کوئی بھی شاعر معروضی حالات سے آنکھیں بند نہیں کر سکتا ۔اور اس کا جمالیاتی احساس بھی کسی نہ کسی طرح سیاسی اور سماجی عمل ہی سے متعلق ہوتا ہے۔ چنانچہ اشیاء کو دیکھنے اور ان سے مسرت کشید کرنے کے پروسیس میں بھی زندگی کی بہت سی چھپی اور ظاہر تلخیاں کچھ پچھتاوے، کبھی یادوں اور کبھی گہرے دکھ و تاسف کی صورت میں ابھر آتی ہیں۔(۱۳)

ادب چونکہ زندگی اور زمین کا نمائندہ ہوتا ہے اس لئے آج کا بلوچ شاعر جب بلوچستان کے سماج کو مختلف مسائل اور مشکلات میں گھرا ہوا دیکھتا ہے تو معاشرے کا ایک حساس فرد ہونے کے ناتے سے وہ ان مسائل کی نشاندہی سمیت ان کا حل تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ سماج کی بدصورتی اور بدنمائیوں کو خوبصورتی میں بدلنے کی تدبیریں کرتا ہے۔ ہمیں یہی احساس جی آر۔ ملا کی غزل میں نمایاں دکھائی دیتا ہے۔ ان کی شاعری میں زندگی کی آگہی اور جدید عہد کے تقاضوں کے شعور کے سمیت ماضی کا فہم بھی نمایاں ہے جہاں وہ ماضی کے عظیم روایات کو قوم کی روح کا مظہر سمجھتے ہوئے اسے حال سے جوڑتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ''بنیادی طور پر ملا ایک عوامی و قومی شاعر ہیں ان کی شاعری میں قومی اقدار و روایات کا احساس نمایاں ہے۔ اور اس کے ساتھ انکی شاعری میں نئے دور کے تقاضوں اور چیلنجوں سے نمٹنے کی تحریک بھی ملتا ہے۔''(۱۴)

ظفر علی ظفر کی غزل ایک خاص مزاج اور آہنگ رکھتی ہیں اور ان کا لب و لہجہ

جمالیاتی اور فنکارانہ معنویت کے ساتھ ساتھ صوتی حسن کاری کا حامل ہے۔ان کے یہاں غزل کی روایتی غم پسندی اور افسردگی کی بجائے ایک رجایانہ اور امید پسندانہ احساس ملتا ہے اور دوسری طرف ان کی غزلوں میں ان کی شخصی مفہوم کے علاوہ سماجی اور قومی احساس کی جھلک بھی ملتی ہے۔

ظفر علی ظفر پچھلے چالیس سال سے مسلسل غزل لکھ رہے ہیں۔جس سے ان کے یہاں موضوعات کی تنوع، گہرائی اور وسعت نظر آتی ہے۔

الفت نسیم کی غزلوں میں غم وتاسف اور ناامیدی کا احساس زیادہ گہرا ہے۔ جس سے ان کے لہجے میں ایک حزینہ کیفیت در آئی ہے۔اس حزینہ کیفیت اور ناامیدی کے احساس کے پیچھے بلوچستان کی سیاسی اور سماجی صورتحال اور خارجی دباؤ کا عمل دخل کارفرما نظر آتا ہے۔"(۱۵)

غزل اور نظم ہر دو اعتبار سے بشیر بیدار کی زبان عوامی ہے وہ سیدھے سادھے الفاظ میں براہ راست بلوچستان کے عوام سے مکالمہ کرتے ہیں۔ان کی زبان سادہ سہل پراثر اور بامعنی ہے۔ان کے الفاظ وتراکیب خالص عوامی اور روزمرہ کے استعمال ہونے والے الفاظ وتراکیب ہیں۔ان کے علامات، تشبیہ واستعارات بھی سادہ اور سہل ہیں۔وہ شعوری طور پر ایسے الفاظ کا انتخاب کرتا ہے۔کیونکہ وہ چاہتا ہے کہ ان کی شاعری کو ہر کہہ ومہہ آسانی سے سمجھ سکے۔اور ان کا پیغام پورے بلوچستان میں، اس خطے میں اور اس خطے سے باہر پوری دنیا میں ہر سچائی پسند، جدوجہد پسند، انسان دوست اور انصاف پسند جمہور تک باآسانی پہنچ سکے۔"(۱۶)

بشیر بیدار بنیادی طور پر رومانی شاعر ہیں۔مگران کی غزلوں میں رومان کے علاوہ ترقی پسندی کے رجحانات نمایاں ہیں۔انہوں نے غزل کے روایتی پیراھن میں نئے معانی بھرے ہیں۔اور غزل کے تنگنائے میں زندگی کے بنیادی حقائق کو سموکرانہوں نے زندگی کے فرسودہ نظام سے نجات حاصل کرنے کی خاطر انقلاب اور تبدیلی کی بات کی ہے۔

غوث بخش صابر کے غزل میں ایک عصری تازگی اور چاشنی ملتی ہے۔سماجی تبدیلی کے حوالے سے انکی تخلیقات میں ترقی پسندانہ سوچ کی جھلک نمایاں ہے۔جبکہ مومن بُزدار کی غزلوں میں رومانیت کے ساتھ ساتھ تصوف کا رنگ بھی شامل ہے۔

مومن بُزدار کے ہاں تصوف کو معاملہ محض علمی نہیں بلکہ اس میں ایک گیرائی اور گہرائی ملتی ہے۔مجاز سے حقیقت اور کثرت سے وحدت کی سفران کی غزل کے نمایاں مدارج ہیں۔جس سے وہ گزرتے اور بڑھتے رہے ہیں۔مومن بُزدار سے پہلے غزل کی ابتدائی دور میں قاضی عبدالرحیم صابر، دوست محمد بیکس ،عنایت اللہ قومی ،میراحمد دہانی ،حکیم خدائے رحیم اور محمد حسین عاجز کی شاعری میں تصوف اور مذہبی مسائل وموضوعات پر اظہارخیال ملتا ہے۔(۱۷)

گوکہ بلوچی شاعری میں تصوف اردو اور فارسی کے مشترکہ اثرات کی وجہ سے داخل ہوا۔لیکن بلوچی میں اس موضوع پر بہت کم ہی اظہارخیال ہوا۔تصوف کے علاوہ مومن بزدار کی غزل میں اپنے عہد کے مسائل کی نشاندہی بھی ملتی ہے۔لیکن اس سے بڑھ کر یہ کہ وہ ڈیرہ غازی خان میں جدید بلوچی شاعری خصوصاً غزل کو متعارف

کرانے والے وہ پہلے شاعر ہیں۔جنہوں نے مثنوی طرز کی روایتی نظم ''دستانغ'' کے اسلوب کو خیر باد کہتے ہوئے جدید نظم اور غزل میں طبع آزمائی کی' جو یہاں کے شعری روایت سے بغاوت اور انحراف کے مترادف تھی۔

جدید نظم اور غزل کی روایت مومن بزدار بلوچستان سے اپنے ساتھ لائے تھے۔کیونکہ وہ نہ صرف بلوچستان کے ادبی تحریکوں اور سرگرمیوں سے بخوبی واقف تھے بلکہ وہ خود بھی بلوچستان کے اکثر و بیشتر مشاعروں اور ادبی و بلوچی اکیڈمی کوئٹہ کے فعال کارکن تھے۔اور بلوچی زبان وادب کی ترقی وترویج میں ان کا کردار نمایاں اہمیت کا حامل تھا۔

مومن بُزدار غزل کے ساتھ نظم بھی لکھتے تھے۔کوہ سلیمان میں غزل کا یہ مسافر کچھ عرصہ تک اکیلا ہی اس دشت میں محو سفر رہا۔لیکن بعد میں اسحٰق ساجد بزدار نے بھی ان سے متاثر ہو کر غزل ہی کو اظہار کا وسیلہ بنالیا۔کوہ سلیمان کی غزل کی تاریخ میں یہ دونوں شخصیت بلا شبہ تحسین وستائش کے قابل ہیں کہ جنہوں نے روایتی ''دستانغ'' کی روایت کو ترک کرتے ہوئے غزل میں نئے تجربے کیئے۔یہاں یہ کہنا ہرگز مقصود نہیں کہ ''دستانغ'' کی صنف اظہار کے لیے ناکافی تھی بلکہ انہوں نے کوہ سلیمان میں بلوچی غزل کی بنیاد ڈال کر بلوچی شاعری کے دامن میں مزید وسعت اور کشادگی پیدا کی۔

مومن بُزدار اور اسحٰق ساجد بُزدار ایک عرصہ تک کوہ سلیمان میں خاموشی سے غزل اور نظم کی آبیاری کرتے رہے۔لیکن عوامی سطح پر وہ اس نئی رجحان کو پھیلانے میں

کوئی بڑا کردار ادا نہ کر سکے لیکن پھر بھی انہوں نے اپنے طور پر یہاں غزل اور نظم کی نئی روایت کو پھلنے اور پھولنے میں مدد دی۔

مومن بزدار کے اثرات کے باعث ہی کوہ سلیمان کے بہت سے نئے شعرا نے ''دستانغ'' کے برعکس غزل ہی کو اظہار کا ذریعہ بنالیا۔ جس میں استاد فقیر محمد بزدار، حیدر بخش بزدار، غوث بخش وفا، استاد عبدالمجید بزدار، کریم بخش بزدار اور سلام چاکری کے نام نمایاں ہیں۔

استاد فقیر محمد بزدار، حیدر بخش بزدار، غوث بخش وفا کوہ سلیمان کے غزل گو شعرا میں اپنا الگ اور منفرد مقام رکھتے ہیں۔ گوکہ ان کی شاعری کا بنیادی موضوع رومان ہی ہے۔ مگر اس رومان میں ذات کی تلخیوں کے ساتھ ساتھ اپنے معاشرہ کے دکھوں اور تلخیوں کی عکاسی بھی ملتی ہے۔

بانل دشتیاری بلوچی زبان کے نامور اور اولین غزل گو شاعر سید ملنگ شاہ ہاشمی کی بیٹی ھیں اور اس ناتے سے انہیں ادبی ذوق وشوق ورثہ میں ملی تھی۔ ملنگ شاہ ہاشمی کی شاعری کے مطالعہ کے اثرات کے باعث ان کی توجہ ادب کی طرف مرکوز ہوئی۔ انہوں نے بلوچی ادب کے علاوہ فارسی، اُردو اور سندھی ادب سے بھی خوشہ چینی کی۔ (۱۸)

بانل دشتیاری بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں۔ اور ان کی شاعری پر سید ظہور شاہ ہاشمی کے اثرات کا چھاپ نظر آتا ہے۔ (۱۹) بانل دشتیاری کراچی کے لیاری جیسے پس ماندہ علاقے میں پیدا ہوئیں۔ جو ہر دور میں سماجی، معاشی اور سیاسی مسائل و

مشکلات کی آماجگاہ بنی رہی۔انہوں نے ترقی سے محروم اسی پس ماندہ ماحول میں اپنی تخلیق سفر کا آغاز کیا۔اور اپنے گردوپیش کے اثرات کے باعث ان کی شاعری میں ایک کرب نظر آتا ہے ''لیکن ان کا یہ کرب انہیں ناامیدی کا شکار ہونے نہیں دیتی بلکہ وہ کرب کو ادراک کی سطح پر محسوس کرتی ہیں۔اور انہیں یہ یقین ہے کہ اس کرب کو زندگی کی زندہ و جاوید قدروں سے جوڑنے کا ایک راستہ بھی ہے۔اور یہ راستہ محبت ہے۔وہ محبت اور دوستی کی اعلیٰ وارفع صفات سے متصف ہوکر ہمیں زندگی کی ارفع اقدار سے آشنا کرتی ہے''۔(۲۰)

بانل دشتیاری کی غزلوں میں قوم دوستی اور وطن پرستی کا جذبہ بھی دیکھنے میں ملتا ہے۔وہ نوابوں،سرداروں،جاگیرداروں کی بجائے عوام ہی کو قوت کو سرچشمہ سمجھتی ہیں۔''اس لیئے انہوں نے اپنی شاعری میں بلوچستان کے محنت کشوں،کسانوں اور مزدوروں کے ہی دکھ اور درد کو اپنا مرکز خیال بنائے رکھا''۔(۲۱)

پیر بخش پیرل نے رومانی اور سماجی دونوں موضوعات پر لکھا ہے۔''ان کے خیال میں ظلم و جبر'' درماندگی و نارسائی عارضی بات ہیں جبکہ سچائی،برابری،انسانی آزادی دائمی قدریں ہیں۔لیکن ان دائمی اقدار کے حصول کیلئے جدوجہد کو بنیادی شرط قرار دیتے ہیں''۔(۲۲)

اسماعیل ممتاز بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں'' ان کی شاعری میں مہرو محبت کا جذبہ اس حد تک نمایاں اور گہرا ہے کہ اسے موجودہ عہد کی بلوچی شاعری کا نمائندہ رومانی شاعر کہا جا سکتا ہے''۔(۲۳)

رومانیت کے اس روایتی اظہار کے علاوہ ان کی غزلوں میں عہد کی بے سرو مانیوں، ناانصافیوں اور سماج کی بدنمائیوں اور بے اعتدالیوں کا ذکر بھی ملتا ہے۔ غلام فاروق بلوچ بلوچی زبان کے ایک معروف نثر نگار ہیں۔ انہوں نے بہت کم شاعری کی ہے۔ وہ غزل لکھتے ہیں۔ ان کی غزلوں میں قومی اور اصلاحی رنگ نمایاں ہے۔ (۲۴)

برکت اللہ بلوچ کی شروع کی شاعری رومانیت زدہ نظر آتی ہے۔ مگر ذہنی و فکری ارتقاء کے مراحل سے گذرنے کے بعد ان کی سوچ میں بتدریج وسعت اور کشادگی پیدا ہوتی ہوگئی اور یوں انکی توجہ اپنے عہد کے مسائل کی طرف مرکوز ہوئی۔ (۲۵)

انور صاحب خان اور اکرم صاحب خان دونوں بلوچی ادب بالخصوص نثر میں مزاح نگار کی حیثیت سے اپنا ایک منفرد مقام رکھتے ہیں۔ لیکن مزاح نگاری کے باوجود ان کی شاعری میں اپنے عہد کی تقاضوں کا اظہار نہایت ہی نفیس اور سنجیدہ ادبی پیرایہ کا حامل ہے۔ اور اس کے ساتھ کہیں کہیں ان کے لہجے میں طنز کا عنصر بھی دیکھنے میں ملتا ہے۔

اسحاق ساجد بزدار کوہ سلیمان کے نامور شاعر اور ادیب ہیں۔ وہ ابتداء میں مومن بزدار سے متاثر ہو کر بلوچی ادب کی طرف راغب ہوئے اور مومن بزدار کے اثرات کے باعث ہی انہوں نے روایتی ''دستانغ'' کو اپنانے کی بجائے جدید نظم اور غزل کو اپنے اظہار کا ذریعہ بنا لیا۔ اسحاق ساجد بزدار کی غزلوں میں ایک بے ساختگی اور چاشنی ملتی ہے۔ بلوچی زبان پر دسترس رکھنے کے باعث ان کی غزلوں میں

الفاظ کا جچا تلا استعمال نہایت ہی برمحل اور موزوں نظر آتا ہے۔ غزل کی روایتی موضوع اور مزاج کے ساتھ ساتھ ان کی شاعری میں اپنے عہد کے مسائل کا شعور بھی ملتا ہے۔

ابراہیم عابد کے اب تک چار شعری مجموعے جن میں ان کے نعتیہ کلام ''مادنیں راہ'' کے علاوہ ''نیکس واہگ ۱۹۷۵''، ''شہم ۱۹۸۵'' اور ''نمیران ۱۹۹۵'' شامل ہیں، شائع ہو چکے ہیں۔ ابراہیم عابد کی غزلوں میں ان کے عہد کے مسائل کو کہیں علامتی اور کہیں دوٹوک انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ ظلم و جبر، ناانصافی، لوٹ کھسوٹ، طبقاتی استحصال اور سماجی بدصورتی کے خلاف ان کے لہجے میں مزاحمت کا عنصر نمایاں ہے۔ وہ خارجی دباؤ کے ساتھ ساتھ سرداروں، نوابوں اور جاگیرداروں کو بلوچستان کے عوام کے مصائب کا ذمہ دار ٹھہراتے ہوئے انہیں ہدف تنقید بناتے ہیں۔ اور ان کے خلاف لڑنے اور جدوجہد کرنے کے لئے بلوچستان کے محنت کش عوام کو متحد ہونے کی تلقین کرتے ہیں۔

رزاق نادر ایک باشعور اور حساس شاعر ہیں۔ اپنے عہد کے شاعروں کی بھیڑ میں ان کا لہجہ ایک نئے طرزِ احساس کا حامل ہے جس میں ان کی شخصی مفہوم سمیت اپنے عہد کا مزاج بھی شامل ہے۔ ان کی غزلوں میں معاشرے کا عمومی غم غزل کے مزاج کا اہم ترین عنصر بن کر سامنے آیا ہے۔

رزاق نادر کی غزل انسانی متعلقات اور اس کے داخلی و خارجی مسائل سے گہرا ربط رکھتے ہیں۔ انہوں نے معاشرتی بے مہری، بے اعتنائی اور محرومی کو دردِ عشق

میں ڈھال کر غزل میں پیش کیا ہے۔ ان کی غزل کا توانا پہلو ان کے استعارے، علامتیں، اشارے اور کنایے ہیں۔ جنہیں ان کو ایک منفرد انداز میں برتنے میں خاصی دسترس حاصل ہے۔

غزل کے حوالے سے اقبال راز ایک دلکش اور دلنشین اسلوب کے مالک تھے۔ ان کی غزلوں میں جذبات کی گھمبیرتا اور احساس کی شدت نمایاں ہے۔ لیکن ان کی بے وقت موت نے ان کے فن کو نکھرنے نہیں دیا۔

تاج محمد طائر افسانہ نگاری بھی کرتے ہیں اور شاعری بھی۔ بلوچی شاعری میں ان کی غزل کا لب ولہجہ تخلیقی خوبصورتی کا آئینہ دار ہے۔ اپنے عہد کے دوسرے شعراء کی طرح ان کے یہاں بھی اپنے عہد کا کرب اور اس کے تقاضوں کی نمائندگی ملتی ہے۔

غلام حسین شوہاز بلوچ کی شعری ڈکشن نہایت ہی پرمایہ اور اوریجنل ہے۔ Craftmanship کے برعکس ان کے یہاں الفاظ کا استعمال متنوع اور فطری انداز میں ہوا ہے۔ (۲۶) انہوں نے دوراز کار علامات اور تشبیہہ واستعارات کی بجائے ادبی ورثہ کے طور پر پہلے سے موجود بلوچی کلاسیکی علائم ورموز کو جدید معانی ومفاہیم میں برت کر اپنی غزل کو ایک نئی جہت اور نیا رنگ دینے کی کوشش ہے۔ ان کے ہاں موضوعات کا دائرہ وسیع ہے۔ ان کی غزل کے موضوعات میں بلوچستان کی معاشرت کے مسائل ومصائب اور اپنے عہد کا کرب اپنی تمام تر جزیات کے ساتھ موجود ہے۔

ستر کی دہائی کے آخری سالوں اور اسی ۸۰ کی دہائی میں نئے شاعروں کی ایک بڑی تعداد سامنے آئی۔ ان میں مبارک قاضی، ڈاکٹر فضل خالق، پروفیسر صباد شتیاری، عابد آسکانی، ڈاکٹر علی دوست، سلطان نعیم قیصرانی، حفیظ حسن آبادی، گل محمد وفا، اسلم ابرار، حسرت بلوچ، رزاق دیدگ، غنی پہوال اور منیر مومن کے نام نمایاں ہیں۔ جنہوں نے غزل کی جانب توجہ دی اور اس کے کینوس کو وسیع تر بنانے کے لئے نئے تجربے کیئے۔ جس سے موضوعاتی سطح پر غزل میں کئی نئے رنگ اور ذائقے شامل ہوئے۔ ان متنوع رنگوں اور ذائقوں میں ان کی ذاتی اور شخصی مفہوم کے اظہار کے علاوہ سماجی اور معاشرتی مفہوم کا عمل دخل نمایاں ہے۔

اس دور کے مختلف آوازوں اور فکر و احساس کی مختلف صورتوں کے درمیان مبارک قاضی کی آواز سب سے نمایاں اور منفرد ہے۔ ان کے یہاں احساس، نیا رجحان نئے موضوعات کے ساتھ لمحہ بہ لمحہ دھڑکتے ہوئے دکھائی دیتا ہے۔ مبارک قاضی کی شاعری میں انفرادی اور اجتماعی دونوں کیفیات شامل ہیں۔ انہوں نے اپنی ذات کے حوالے سے کیفیات و احساسات کو ایک نیا فکری رنگ بخشا ہے۔ جو اس کی آشوب ذات کی سرحدوں سے نکل کر آشوبِ آگہی کی صورت اختیار کر گیا ہے۔ وہ ذات کے وسیلے سے معاشرے کے مسائل کو سمیٹتے ہوئے نظر آتا ہے۔

فکری حوالے سے ان کی غزل میں روایت اور جدت کا ایک حسین امتزاج دیکھنے میں آتا ہے۔ انہوں نے جدید حسیت کے ساتھ جدید تقاضوں کو غزل میں سمونے کی کوشش کی ہے۔ جس سے ان کی غزل کے لہجے میں ایک عصری تازگی اور

توانائی در آئی ہے۔

ڈاکٹر فضل خالق کی غزل کا دلکش اور سریلا لہجہ بلوچی شاعری میں اپنا ایک الگ ذائقہ اور تاثر رکھتا ہے۔ ان کی غزل کی رومانیت اپنے عہد کے سیاسی کشمکش اور سماجی صورتحال سے جڑا نظر آتا ہے۔ جس سے ان کے یہاں داخلی اور خارجی تجربات کی ہم آہنگی نظر آتی ہے۔ ان کے ہاں اپنے عہد کا سیاسی اور سماجی المیہ دوٹوک انداز کی بجائے استعاروں کے ذریعے بیان کیا گیا ہے۔ اس طرح ان کی حقیقت نگاری علامتی روپ اختیار کر گئی ہے۔

صبا دشتیاری کی غزل میں رومانیت سے زیادہ زندگی کے حقائق اور کائنات میں موجود ابدی صداقتوں اور سچائیوں کا احساس نمایاں ہے۔ ان کے یہاں حسن و عشق کے مجرد اور مبہم تصورات کے برعکس زندگی کی کشمکش اور روح عصر کے اضطراب کو اجاگر کیا گیا ہے۔ جس سے ان کی غزلوں میں مصائب و مسائل سے شدت کے ساتھ نبرد آزما ہونے اور تغیر و تبدیلی کے احساس کو تقویت ملی ہے۔ دوسری طرف ان کی غزلیں نئے طرز احساس کے حامل ہونے کے ساتھ فنی پختگی اور تخلیقی خوبصورتی کی آئینہ دار بھی ہیں۔

بلوچی زبان اور اس کی روایت پر مکمل دسترس رکھنے کے باعث عابد آسکانی کی غزل میں روایت کا رچاؤ، لفظوں کی مزاج شناسی اور ان کا جچا تلا استعمال اور ان کے فکر کی بھرپوریت کی کارفرمائی نمایاں ہے۔

ڈاکٹر علی دوست کی غزلوں میں رومان کا چھاپ تو نظر آتا ہے۔ لیکن مبہم اور

مجرد رومانیت کے برعکس ان کے یہاں محبت کا گہرا شعور اور ادارک ملتا ہے۔ ان کی غزلوں میں جمال پرستی بھی ہے اور انسانی دوستی بھی۔ اور یہ دونوں جذبے مل کر ان کی غزل کو ایک نیا احساس عطا کرتے ہیں۔

سلطان نعیم قیصرانی کی نظم کی طرح ان کی غزل میں بھی ایک قسم کا تفکر اور تعقل نمایاں ہے۔ وہ مختلف جذبوں اور مظاہر کو تجزیاتی نظر سے دیکھتے ہیں۔ ان کے انداز بیان میں مشاہدے کی گہرائی، اشاریت اور معنی آفرینی نمایاں ہے۔ سلطان نعیم قیصرانی نے اپنی غزلوں میں داخلیت اور خارجیت کے حسین امتزاج سے اپنی ذات اور معاشرت کی پیچیدگی اور تہہ داری کو موضوع بنایا ہے۔ جس کے باعث وہ بیک وقت جمالیاتی اور جدلیاتی دونوں پہلوؤں کو سمیٹتا ہوا نظر آتا ہے۔

حفیظ حسن آبادی کو اپنے عہد اور اس کے مسائل کا بھرپور شعور ہے۔ ان کی غزلوں میں مسائل و مشکلات سے نبرد آزما ہونے اور زندگی کے فرسودہ اور بوسیدہ نظام کو بدلنے اور اس کی جگہ ایک غیر استحصالی اور غیر طبقاتی معاشرہ قائم کرنے کی آرزو اور خواہش نمایاں ہے۔

اسلم ابرار کی غزلوں میں روحِ عصر کے اضطراب کے ساتھ ساتھ آشوبِ ذات کی کارفرمائی بھی نظر آتی ہے۔ انہوں نے اظہار ذات کے حوالے سے اپنے موجود کی حقیقتوں کا ادارک کرنے اور اپنے حوبوں، خواہشوں اور آرزوؤں کا اظہار کرنے کی کوشش کی ہے۔

غنی پہوال کی غزل کا لہجہ نہ صرف دلکش اور رخوبصورت ہے بلکہ ملائم اور

شائستہ بھی ہے۔ان کی غزل کے موضوعات میں اظہار ذات کے علاوہ قومی اور تاریخی شعور کی کروٹیں بھی دیکھنے میں آتی ہیں۔

گل محمد وفا کی غزل کا ذائقہ بلوچی شعری روایت سے ہمرشتہ ہونے کے باوجود ایک نیا ذائقہ ہے۔ان کی غزل میں سیاسی جبر کے خلاف مزاحمت اور عشق کے موضوعات غالب دکھائی دیتے ہیں۔

غزل کے حوالے سے منیر مومن نے نہ صرف اپنے لئے ایک نیا لہجہ دریافت کرنے کی کوشش کی ہے بلکہ غزل کے پیرایہ ہائے اظہار کو نئی صورت گری عطا کی ہے۔انہوں نے روایتی تشبیہات واستعارات کے برعکس نئے تشبیہوں اور استعارات سے کام لے کر غزل کو ایک نئی تازگی اور توانائی فراہم کی۔

نئی تشبیہات واستعارات کے علاوہ پیکر تراشی ان کے اسلوب کا ایک نمایاں وصف ہے۔ان کے پیکر متحرک اور متنوع رنگوں کے حامل ہیں جن کی مدد سے وہ اپنے خیالات واحساسات کو غزل کی کینوس پر منتقل کرتے ہیں۔ان کے ہاں کہیں کہیں فکر و خیال کی بجائے جذبہ احساس کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔غزل کی نسبت یہ صورت حال ان کی نظموں میں نمایاں ہے۔لیکن کہیں کہیں انہوں نے غزلوں میں بھی صرف لفظوں کے ذریعے جمالیاتی تجربہ کا اثر پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔

حسرت بلوچ کی غزلیں عصری صورتحال کی تصویر کشی کے ساتھ فنی پختگی، تخلیقی اظہار اور جدید لب ولہجہ کی آئینہ دار ہیں۔

رزاق دیدگ کی غزلوں میں درد وغم کی کثرت اور اُداسی کی فضا مسلط ہے۔

رزاق دیدگ چونکہ اپنے مزاج کے مطابق غم پسند واقع ہوئے تھے۔جس سے ان کی شاعری کا مجموعہ تاثر غم کی شکل میں سامنے آیا۔ان کی غم پسندی کا سبب ان کی یاسیت زدگی تھی ۔کیونکہ محبت کی ناکامی نے نہ صرف انہیں یاسیت کا شکار بنایا تھا بلکہ اسی یاسیت کے باعث وہ نوعمری ہی میں خودکشی کرنے پر مجبور ہوئے۔

اسی ۸۰ کی دہائی کے آخر میں بلوچستان کی سیاسی اور قومی تحریک مکمل طور پر انتشار و خلفشار سے دوچار ہوئی۔سیاسی تحریک کی ناکامی کے نتیجے میں بلوچ معاشرت نہ صرف زندگی کی اجتماعی سطح پر شکست وریخت سے دوچار ہوئی بلکہ داخل سطح پر بھی ہر فرد اندر سے ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوگیا۔دوسری طرف بلوچی زبان وادب کی تخلیقی تحریک جو سیاسی تحریک سے بالواسطہ طور پر نمو پاتی رہی تھی،مکمل طور پر دم توڑ گئی۔

زوال و انتشار کی اس صورتحال نے مجموعی طور پر بلوچی ادب میں شکست خوردگی ،سراسمگی،بے چینی ،مایوسی ،بے حسی ،بے سمتی ،مغائرت اور بیگانگی کے اثرات مرتب کیئے ۔اور اس تمام صورتحال کا اظہار اس عہد کے شعرا کے ہاں یکساں طور پر نمایاں نظر آتا ہے۔

نوے کی دہائی سے لے کر بیسویں صدی کی اختتام تک بلوچی غزل شعرا کی تعداد میں ایک قابل قدر اضافہ تو دیکھنے میں آتا ہے۔لیکن گنتی کے چند ایک شعرا جنہوں نے کسی حد تک اپنے لیے نیا راستہ تلاش کرنے کی کوشش کی ہے اور کچھ ایسے بھی ہیں کہ جو ابھی تک تجربوں میں لگے ہوئے ہیں ۔کو چھوڑ کر سب کے ہاں خیال واحساس کی سطحیت اور سوچ وادراک کی یکسانیت نمایاں ہے۔بنیادی طور پر ان شعرا کا

دکھ اور تجربہ ایک ہے، اس لیے انکی شاعری میں بڑی حد تک مماثلت اور مشابہت پائی جاتی ہے۔

مجموعی طور پر اس دور کی شاعری میں ایک طرف مبہم رومانیت، فردیت پرستی اور حد درجہ دروں بینی کا عنصر نمایاں ہے۔ جس سے ان کی تخلیقات میں عجیب طرح کا کرب، دکھ اور گھٹن کا آسیب اپنی تمام تر عفریت کا سامان لیے نظر آتا ہے۔

دوسری طرف اس عہد کے شعرا کے یہاں کوئی واضح تصور اور کوئی واضح نظریہ نہ ہونے کے باعث خیال کے ارتقاء کی سانس رکتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ زندگی کی یہی بے معنویت اور لامرکزیت تخلیقی سطح پر نئی نسل کے شعرا کو اندر سے گھن کی طرح چاٹ رہی ہے۔

تاہم نوے کی دہائی میں نئے ابھرنے والے شاعروں کے جم غفیر میں منظور بسمل، ارشاد پرواز برکت علی سجاد، چراگ لاشاری مرحوم۔ علی بخش دشتیاری، مومن معراج، اسحاق خاموش، عارف عزیز، سلام چاکری اور میر عمر میر کے نام نمایاں ہیں۔

ان نئے غزل گو شعرا میں منظور بسمل ایک معتبر نام ہیں۔ ان کی غزل میں احساس کی شدت اور شعور کی گھمبیرتا نمایاں ہے۔ اس احساس کی شدت اور شعور کی گھمبیرتا نے ان کے فن کو جلا بخشی ہے۔ ان کی غزلوں میں ان کے عہد کا المیہ غزل کے مزاج سے ہم آہنگ نظر آتا ہے۔ ان کے اسلوب کا توانا اور نمایاں پہلو ان کے وہ بامعنی اور متحرک پیکر ہیں۔ جنہیں وہ احساس و ادراک کی سطح پر برت کر دوسروں تک پہنچاتا ہے۔

منظور بسمل اگر چہ بنیادی طور پر رومانی شاعر ہیں مگر انہوں نے زندگی کے بنیادی حقائق کو بھی اپنے فن میں جگہ دی ہے۔ جس کے باعث انہوں نے اپنی غزل کے لیے نئے امکانات پیدا کیے ہیں۔

منظور بسمل کے علاوہ سلام چاکری بھی غزل کے نئے ابھرتے ہوئے شاعر ہیں۔ ان کی شاعری بہت حد تک اپنے عہد کے دوسرے شعرا کی نسبت ایک منفرد اور نمایاں لہجے کی غماز ہے۔ سلام چاکری کی غزلیں بجا طور پر ان کی فنی پختگی اور تخلیقی کرب کی آئینہ دار ہیں۔ اور ان سے بجا طور پر یہ امید کی جا سکتی ہے کہ وہ مستقبل میں اپنے لیے کوئی نیا لہجہ دریافت کرنے میں کامیاب ہوں گے۔

اسی طرح میر عمر میر، عارف عزیز مومن معراج ارشاد پرواز اور اس قبیل کے دوسرے نوجوان شعراء جو تجربہ کرنے میں لگے ہوئے ہیں، مواد و موضوعات کے اعتبار سے ان کے سامنے ایک وسیع تر شعری کائنات اپنے تمام تر امکانات کے ساتھ موجود ہے۔ لیکن نقش تب ہی جاوداں اور دیرپا ثابت ہو سکتی ہیں۔ جب ان میں خون جگر کی آمیزش ہو۔

(حوالہ جات)

(۱) سید ظہور شاہ ہاشمی ،بلوچی زبان وادب کی تاریخ ،کراچی ،سید ظہور شاہ اکیڈیمی ۱۹۸۶ء ص ۱۲۵

(۲) صبا دشتیاری، انگریں واھگ ،کراچی ،سید ہاشمی ریفرنس لائبریری ۱۹۹۹ء ص ۶۲

(۳) صبا دشتیاری، انگریں واھگ ص ۶۶

(۴) ---ایضاً--- ص ۶۵

(۵) صبا دشتیاری، گلکارءُ چکنکار، کراچی، بہارگاہ پبلیکیشنز ۱۹۹۰ء ص ۴۵

(۶) غوث بخش صابر، بلوچی ادب، اسلام آباد، اکادمی ادبیات پاکستان ص ۱۰۲

(۷) صبا دشتیاری ،(پیش گال) جگرءِ کپوت ،عنایت اللہ قومی ،پنجگور ،عزت اکیڈیمی ۲۰۰۰ء ص ۱۰، ۱۱

(۸) محمد بیگ بلوچ، (پیش گال) زپتیں زہیر، احمد زہیر، کراچی، پاذل اکیڈیمی ۱۹۷۰ء ص ۱۰

(۹) صبا دشتیاری، گلکارءُ چکنکار، کراچی، بہارگاہ پبلی کیشنز ۱۹۹۰ء ص ۴۶

(۱۰) صبا دشتیاری، گلکارءُ چکنکار، ص ۴۸

(۱۱) صبا دشتیاری، انگریں واہگ، کراچی، سید ہاشمی ریفرنس لائبریری ۱۹۹۹ء ص ۱۸۲

(۱۲) صبا دشتیاری، انگریں واہگ، ص ۱۸۴

(۱۳) رشید امجد، یافت دریافت، لاہور، مقبول اکیڈیمی ۱۹۸۹ء ص ۱۶۳

(۱۴) غلام فاروق بلوچ،نوکیں تام،کراچی،بلوچی لنبرانکی دیوان۱۹۸۵ء،ص۸۰

(۱۵) غلام فاروق بلوچ،نوکیں تام، ص۱۸۴

(۱۶) غلام فاروق بلوچ (پیش گال)ھزام،بشیر بیدار،کراچی،بلوچ کلچرل اینڈ ریسرچ ایسوسی ایشن۱۹۹۰ء،ص۲۵

(۱۷) غلام فاروق بلوچ،نوکیں تام،کراچی،بلوچی لبنرانکی دیوان۱۹۸۵ء،ص۱۰۹

(۱۸) صبادشیتاری،انگریں واہگ،کراچی،سید ہاشمی ریفرنس لائبریری۱۹۹۹ء،ص۱۰۹

(۱۹) صبادشیتاری،انگریں واہگ،ص۱۱۲

(۲۰) ۔۔۔۔ایضاً۔۔۔۔ص۱۱۸

(۲۱) ۔۔۔۔ایضاً۔۔۔۔ص۱۲۰

(۲۲) غلام فاروق بلوچ ،نوکیں تام،کراچی ،بلوچی لبنرانکی دیوان ۱۹۸۵ء ص۱۴۹،۱۵۰

(۲۳) غلام فاروق بلوچ،نوکیں تام،ص۹۴

(۲۴) ۔۔۔۔ایضاً۔۔۔۔ص۱۴۰

(۲۵)۔۔۔۔۔ایضاً۔۔۔۔ص۱۴۰

(۲۶)محمد بیگ بیگل ،(پیش گال)جالبار،غلام حسین شوہاز،کراچی۱۹۹۴ء،ص۱۴

ماحصل

Conclusion

ماحصل (Conclusion)

بلوچی شاعری کی پانچ سوسالہ ادبی تاریخ کی روشنی میں یہ بات واضح ہو جاتی ہے۔ کہ بلوچی کی شعری روایت ''نظم'' کی شاعری ہے۔ جولوک ادب سے لے کر کلاسیکی شاعری تک اس کی مرکزی روایت رہی ہے۔

غزل، قصیدہ یا ایسے دوسرے اصناف کی شاعری ایک خاص نوع کی تہذیبی ترقی اور ماحول وحالات کی پیدوار ہونے کے ناطے سے بلوچستان کے مخصوص سماج، زمین، تہذیب اور معاشرت سے لگانہ رکھنے کے باعث بلوچی شعری مزاج میں اپنی جڑیں پیوست کرنے کی متحمل نہیں ہوسکتی تھیں۔

گوکہ قیام پاکستان سے چند سال پہلے بلوچی شاعری میں غزل نہ صرف ایک متعارف سخن کی حثیت سے اپنی جڑیں پیوست کرنے میں کامیاب نظر آتی ہے۔ لیکن بلوچی شعری روایت کے زیراثر ہونے کے باعث اردواور فارسی غزل کی مجموعی مزاج کے برعکس ایک جداگانہ لب ولہجہ ایک منفرد رنگ وآہنگ اور ایک وسیع موضوعاتی دائرے کا مالک بھی ہے۔

غزل کے برعکس نظم شروع سے ہی بلوچی شعری روایت کی بنیاداور منبع رہی ہے۔ اور موجودہ بلوچی نظم کلاسیکی بلوچی شعری تکنیک کے فطری ارتقاء کا مظہر ہے۔ جو اپنی ہیئت کے اعتبار سے بہت حدتک آزاد ہیئت کی حامل ہے۔ لیکن یہ اردو کی نظم کے برعکس ''اوستا'' کے منظوم ''گاتھاؤں'' اور سنسکرت کے ''چھند'' سے مشابہت رکھتی

ہے۔

دستیاب کلاسیکی شاعری جو ۱۴۵۰ء سے لے کر ۱۹۴۵ء تک تین بڑے ادوار ''رندعہد'' ''عہدخوانین'' اور ''برطانوی عہد'' پر محیط ہے۔ کم وبیش پانچ سوسال کے اس طویل شعری سفر میں محبت اور مزاحمت کا عنصر نہ صرف غالب احساس کے طور پر اس کے خمیر میں شامل رہا ہے۔ بلکہ مرکزی روایت کے طور پر اس کے رگ وپے میں لہو کی طرح رواں دواں دکھائی دیتا ہے۔

جدید بلوچی شاعری بھی انفرادی اور اجتماعی مفہوم سمیت محبت اور مزاحمت کے انہی دو طاقت ور رویوں کے گرد اپنا تابانا بنتی ہوئی نظر آتی ہے۔ بلوچی شاعری کا دوسرا بڑا اہم عنصر یہ ہے کہ یہ شروع دن سے ہی عصری شعور، روشن خیالی اور حقیقت پسندی کا مظہر رہی ہے۔ اور یہ کسی بھی عہد میں اپنی زمین، ماحول اور تہذیب ومعاشرت سے بے تعلق نہیں رہی۔

کلاسیکی شاعری سے لے کر جدید بلوچی شاعری تک بلوچ شعراء نے اپنی شاعری میں فنی محاسن کے ساتھ ساتھ روحِ عصر کو سمونے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ ادب میں کومٹ منٹ، وابستگی اور مقصدیت ہمیشہ ان کے پیش نظر رہی۔ بلوچ شاعروں نے سماجی ذمہ داری کے سوال کو ادب میں نمایاں اہمیت دی اور ان کے ہاں ادب کے بے مقصد ہونے کا تصور ہی نہیں۔

کلاسیکی عہد کے نامور شاعر میر بیورگ نے تو یہاں تک کہا تھا کہ شاعری تو صرف بہادر لوگ ہی کر سکتے ہیں۔ ان کے نزدیک بزدل آدمی شاعری کر ہی نہیں سکتا۔

جدید بلوچی شاعری بھی اسی کلاسیکی شعری تصور پر یقین رکھتی ہے۔

جدید بلوچی شاعری کی ابتداء اور ترقی وترویج کا عہد قیام پاکستان سے چند سال پہلے کا وہ زمانہ ہے۔ جہاں سیاسی آزادی کی تحریکات کے زیر اثر پورے برصغیر میں انگریزی استعماریت کے خلاف زبردست جدوجہد ہورہی تھی۔ برطانوی دور میں برصغیر میں سیاسی تحریکات کے اثرات نے جہاں ایک طرف بلوچستان کے عوام میں سیاسی اور سماجی بیداری کی ایک لہر پیدا کی۔ وہیں پہ دوسری طرف سیاسی اور سماجی تحریکات کے پہلو بہ پہلو ایک ادبی اور ثقافتی تحریک بھی وجود میں آگئی۔

اس جدید ادبی اور ثقافتی تحریک کے سرخیل میر گل خان نصیر، محمد حسین عنقا اور آزات جمالدینی تھے۔ جنہوں نے اپنے عہد کے تقاضوں کو سامنے رکھتے ہوئے بلوچی شاعری کو نئے رویوں اور رجحانات سے ہمکنار کیا۔ گوکہ آزادی کے چند سال پہلے سیاسی تحریکات کے نتیجے ہی میں جدید بلوچی شاعری کی تشکیل ممکن ہوئی۔ لیکن بلوچی زبان وادب کی ترقی وترویج کا حقیقی دور قیام پاکستان کے بعد ہی شروع ہوتا ہے۔ جہاں بلوچی شاعری سمیت جدید نثری ادب کے تخلیق کا سلسلہ بھی شروع ہوا۔

آزادی سے پہلے کا عہد چونکہ سماجی تحرک کی ابتداء کا دور تھا۔ اس لیے اس دور میں وطن دوستی اور قوم پرستی کی تحریک کے زیر اثر شاعری کو وطن اور اس کے مظاہر سے قریب تر کرنے کی ایک شعوری اور فکری روش سامنے آیا۔ بلوچ شاعروں نے اپنی شاعری کے ذریعے بلوچ عوام میں جذبہ حریت ابھارنے اور انہیں انگریزی استعمار اور ان کے کاسہ لیسوں کے خلاف منظم کرنے کی کوشش کی۔ سماج کے ایک

بلند تر سطح پر بلوچ قوم کو مخاطب کرنے کے نتیجے میں اس دور کی شاعری میں داخلی رخ کی بجائے سماجی اور قومی رخ زیادہ نمایاں ہو کر سامنے آئی۔

جدید بلوچی شاعری میں ہیئت اور مواد کے اعتبار سے نئی نظم کا پہلا تجربہ ہمیں میر گل خان نصیر اور غزل کا تجربہ ملنگ شاہ ہاشمی کا ہاں نظر آتا ہے۔ نظم کے برعکس غزل کی روایت بلوچی شاعری میں موجود نہ تھی۔ بلوچی غزل کی ابتداء کا حقیقی دور پچاس کی دہائی کی ابتدائی سالوں سے شروع ہوتا ہے۔ اس ابتدائی دور میں چند ایک کو چھوڑ کر بیشتر شاعروں کے ہاں غزل کا عمومی اور روایتی مزاج کارفرما نظر آتا ہے۔ اردو اور فارسی کے روایتی تشبیہات واستعارات، تلمیحات ولفظیات کے استعمال سمیت فکرو خیال میں بھی سطحیت اور یکسانیت نمایاں ہے۔ مگر بعد کے آنے والے ادوار میں صورتحال اس سے مختلف نظر آتی ہے۔ کیونکہ وطن پرستی اور قوم دوستی کے حوالے سے ایک نیا فکری رویہ سامنے آیا۔ تھا، جس کی وجہ سے غزل کا رخ روایتی موضوعات کے برعکس نئے تقاضوں اور جدید فکر کی طرف راغب ہوا۔ اس لئے بہت سے شعراء نے خود کو فارسی اور اردو کے اثرات سے بچا کر نہ صرف بلوچی شعری لہجہ اختیار کیا۔ بلکہ فکری سطح پر بھی غزل کے ماورائی جذبہ سے دامن چھڑا کر عصری مسائل کے اظہار کو اپنے فن کا وسیلہ بنالیا۔

اس سلسلے میں سب سے پہلے میر محمد حسین عنقا اور بعد میں سید ظہور شاہ ہاشمی نے اپنی شاعری میں نہ صرف خالص بلوچی لب ولہجہ، زبان وبیان، الفاظ وعلامات اور تشبیہات واستعارات سے کام لیا بلکہ غزل کو معاشرتی اور سماجی تبدیلیوں اور تقاضوں

سے ہم آہنگ کیا۔

محمد حسین عنقا اور سید ہاشمی کے بعد مراد ساحر غزل کا سب سے بڑا نام ہے۔ جنہوں نے روائتی تشبیہات واستعارات اور مستعار تقلیدی افکار کے برعکس غزل کو نئی تشبیہوں، نفیس بندشوں اور نئی سوچ سے ہمکنار کیا۔

عشق غزل کا مرکزی اور بنیادی موضوع رہا ہے۔ روایتی غزل کے ہاں یہ عشق محبوب کا فراداؤں، اس کی رعنائیوں، ہجر کے دکھ اور وصال کی لذت کے گرد احساس کا ہالہ بنتا رہا۔ کبھی یہ ماورائی جذبہ کے طور پر غزل میں ایک مبہم رومانیت کے تصور میں ڈھلتا رہا۔ لیکن سماجی کشمکش اور زندگی کی شکست وریخت کے نتیجے میں غزل کے عشق کے دائرہ کار میں وسعت آ گئی۔ جس سے محبوب کا تصور بھی بدل گیا۔ اس کے خدوخال بھی بدل گئے۔ اس طرح یہ تصور کہیں لیلائے وطن کے روپ میں ڈھل گیا۔ اور کہیں یہ تصور ایک بہتر اور خوشحال معاشرے کی آرزو بن گیا۔

بلوچی غزل میں بھی یہ عشق ایک نئی رومانیت اور نئی معنویت میں ڈھلتا رہا۔ یہ نئی رومانیت، دھرتی اور اس کے مظاہر سے شدید محبت اور چاہت کا اظہار ہے۔ سب سے پہلے غزل میں اس نئی رومانیت کا اظہار مراد ساحر نے کیا۔ اور انہوں نے عشق و حسن کے پس منظر میں عصری سائل اور سماجی کشمکش کو اجاگر کیا۔

مراد ساحر کے بعد آنے والے ادوار میں غزل کے تمام شعراء نے اس روایت کو اپنا مرکز خیال بنائے رکھا اور اس طرح سے بلوچی غزل ایک نئی رومانیت اور نئی معنویت کی حامل بنی رہی۔ گوکہ ساٹھ کی دہائی تک کے عرصہ میں غزل کے مقابلے

میں فکری اور فنی طور پر نظم نے زیادہ ترقی کی۔ کیونکہ غزل کے روایتی اور محدود ہیئت کے برعکس نظم میں اظہار خیال کی زیادہ وسعت اور گنجائش موجود تھی۔ لیکن ساٹھ کی دہائی کے بعد نظم کے پہلو بہ پہلو غزل بھی معاشرتی تبدیلیوں اور فکری کروٹوں کے باعث معاشرتی سطح پر اپنا رشتہ استوار کرنے میں کامیاب رہی۔ جس سے نہ صرف غزل کو ایک نئی تازگی اور توانائی میسر آئی۔ بلکہ یہ ایک مقبول صنف سخن کے طور پر اپنے سماج، ماحول، زمین اور تہذیب کی نمائندگی کرنے میں کامیاب رہی۔

جبکہ دوسری طرف جدید نظم کے ابتدائی دور میں میر گل خان نصیر کے علاوہ محمد حسین عنقا، مراد آوارانی، میر عیسیٰ قومی، اسحاق شمیم آدم حقانی، جمعہ کلانچی اور کئی دوسرے شعرا نے بھی جدید نظم کی بنیاد رکھنے میں اپنا کردار ادا کیا۔ اور ان سب کا موضوعاتی دائرہ بلوچ اجتماعیت، قومی جذبہ، قومی تشخص، سیاسی وسماجی شعور اور سرداری نظام کی مخالفت اور غریبوں کی ابتر زندگی جیسے مسائل و تصورات کے گرد گھومتا نظر آتا ہے۔

لیکن اس ابتدائی دور میں محمد حسین عنقا کے سوا ان کے فن کو وہ گیرائی اور گہرائی میسر نہ آسکی جو انہیں کسی واضح اور منفرد رجحان ساز کے طور پر بلوچی ادب میں ایک الگ مقام عطا کرنے کا سبب بنتا۔ لیکن ان کے لئے یہ بات بھی کسی عز و فخر سے کم نہیں کہ جدید بلوچی شاعری کی تاریخ ان کا تذکرہ کیئے بغیر آگے بڑھ ہی نہیں سکتی۔

میر گل خان نصیر کی شہرت کے دوران ہی آزات جمالدینی نے بھی نظم کا سہارا لیا۔ لیکن آزات جمالدینی کی شاعری اپنے عہد کے موضوعات سے ہم آہنگ

ہونے کے باوجود نظم کی تحریک میں سب سے الگ اسلوب اور منفرد لہجہ رکھتی ہے۔ کیونکہ انہوں نے خارجی زندگی کے اظہار کے ساتھ ساتھ داخلی احساسات کو بھی نظم میں جگہ دے کر اسے ایک نئی فنی اور معنوی دبازت عطا کی۔ اور جدید بلوچی شاعری میں پہلی بار ''نظم آزاد'' کی بنیاد رکھنے اور اسے فروغ دینے میں بنیادی کردار ادا کیا۔

میر گل خان نصیر، محمد حسین عنقا اور آزات جمالدینی اور اس عہد کے دوسرے شعرا کے بعد ہئیتی اور موضوعاتی اعتبار سے جو وسعت اور کشادگی عطا شاد نے پیدا کی ، بلوچی نظم کی تاریخ میں اس کا نظیر ملنا مشکل ہے۔ عطا شاد سے پہلے نظم کے فکری ارتقاء کے باوجود اس کے ڈھانچے میں کوئی بڑی تبدیلی اور پیش رفت نظر نہیں آتی ۔ یہ عطا شاد ہی تھے جنہوں نے فنی اور فکری اعتبار سے نئی نظم کو نئی بنیادیں فراہم کیں۔

عطا شاد کے ساتھ ساتھ اشرف سربازی، صدیق آزات، کریم دشتی، ملک طوقی اور اکبر بارکزئی نے بھی ''نظم آزاد'' کو نہ صرف متعارف کرانے بلکہ اسے نئی بنیادیں فراہم کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ اور انہی کے کوششوں کے باعث بعد کے ادوار میں نئی نظم نئے کروٹوں اور نئے زاویوں سے آشنا ہوئی۔

وقت کے بدلتے تقاضوں اور عصری آگہی کے سبب بلوچ شعرا کے تصور حیات اور تخلیقی شعور اور صلاحیتوں میں بڑی کشادگی اور وسعت پیدا ہوئی، جس سے بلوچی شاعری کا رخ کائنات میں بنیادی صداقتوں اور سچائیوں کی تلاش کے عمل کے سمیت ایک عالمگیر سوچ کی طرف مڑ گیا۔ انہوں نے ایک خاص خطہ زمین کے حوالے سے اپنی پہچان کرانے اور اپنی زبان اور تاریخ و تہذیب کی بازیافت کے عمل

کے ساتھ ساتھ عالمگیر انسانیت کے تصور کو بھی اپنی تخلیقات کا حصہ بنالیا۔ جس سے ان کے اظہار میں ایک گہرائی اور گیرائی پیدا ہوئی۔ اور ان کے بعد کی نئی نسل شعرا نے عالمی اجتماعی احساس کو اپنے فن کا مینی فیسٹو (Manifesto) قرار دیا۔

بلوچستان کی مجموعی موضوعی اور معروضی صورتحال کے باعث جدید بلوچی شاعری (غزل و نظم) کے موضوعاتی دائرے میں چھ بڑی نمایاں لہریں دیکھنے میں آتی ہیں۔

سب سے پہلی لہر جس نے پاکستان کے بننے سے پہلے انگریز استعماریت کے خلاف مزاحمت کے نتیجے میں جنم لی تھی۔ اس نے وطن دوستی اور قوم دوستی کی ایک مکمل فکری تحریک کی صورت اختیار کر لی۔

آزادی کے بعد یہ لہر نہ صرف برقرار رہی بلکہ اس میں ہر گزرتے لمحہ کے ساتھ وسعت اور شدت آتی گئی۔ قوم دوستی اور وطن دوستی کی لہر میں شدت آنے کی بڑی وجہ وطن عزیز کی وہ مجموعی صورتحال ہے۔ جہاں اس کے قیام کے وقت یہ امید بندھ چکی تھی کہ اب غلامی، غربت، جہالت، افلاس، لوٹ کھسوٹ، اقرباء پروری، ناانصافی، نابرابری، استحصال اور طبقاتی فرق و تضاد سے نجات ملے گی۔ لیکن آزادی کے بعد جلد ہی یہ احساس ہونے لگا کہ جس مقصد کی خاطر اس ملک کو حاصل کیا گیا۔ وہ نہ صرف پوری ہوتی دکھائی نہیں دیتی بلکہ ظلم و ستم، ناانصافی، استحصال، عدم مساوات اور غربت میں کچھ زیادہ ہی اضافہ ہونے لگا ہے تو اس صورتحال میں مایوسی اور ناامیدی سمیت وطن دوستی اور قوم دوستی کی لہر میں بھی نمایاں شدت آ گئی۔

جبکہ دوسری طرف سیاسی اور اقتصادی محرومیوں اور مسلسل خارجی دباؤ اور سیاسی جبریت کے نتیجے میں بلوچی ادب میں احتجاج بغاوت، مزاحمت اور انکار کی ایک نئی اور دوسری لہر وجود میں آئی۔ جس نے بلوچی شاعری کو ایک نئی صورتحال سے دوچار کیا۔

تیسری لہر ۱۹۸۸ء کے بعد بلوچ قوم پرست تحریک کے انتشار و خلفشار کے نتیجے میں سیاسی اور قومی بلوچ رہنماؤں کے خلاف مایوسی، نفرت اور بیزاری کی صورت میں نمودار ہوئی۔

چوتھی اور پانچویں لہر بالترتیب عالمی طرز احساس اور امید ورجائیت جو کہ جدید بلوچی شاعری کے مستقل اور پائیدار مظہر ہیں سے عبارت ہیں۔

جب کہ چھٹی اور آخری لہر بیسویں صدی کے آخری دو دہائیوں میں بلوچستان کی سیاسی، سماجی اور معاشرتی انتشار و بگاڑ کے نتیجے میں در آنے والی وہ لہر ہے۔ جس سے نوجوان نسل کے شعرا کو نہ صرف ذات کی طرف مراجعت کرنے پر مجبور کیا۔ بلکہ زندگی اور اجتماعیت سے بھی برگشتہ کر دیا۔

بلوچی ادب میں کوئی بڑی تخلیقی تحریک نہ ہونے اور جدید بلوچ شعرا کے ہاں کوئی واضح تصور اور واضح نظریہ نہ ہونے کے باعث ادب میں لامرکزیت، بے نامیت اور بے مقصدیت کا زہر سرایت کرتا جا رہا ہے۔ جس سے بلوچی ادب اور کلچر مرگ آمادہ نظر آتا ہے۔ دوسری طرف نئی نسل کے شعرا فرسودہ اور بوسیدہ زوال پسند رویوں اور اسلوب کو جس انداز سے برت رہے ہیں۔ وہ ایک اعتبار سے کلیشے کی

شکل اختیار کر رہا ہے۔ایک ہی طرح کے تجربات وواردات کی تکرار سے نئی شاعری کا پھیلاؤ بہت حد تک ٹھہراؤ اور جمود کا شکار نظر آتا ہے۔

کیونکہ زندگی میں نظریات، عصری حقائق اور تقاضے بدلتے رہتے ہیں۔کسی ادب کا صرف اس لیے زیادہ عرصہ تک زندہ رہنا نہایت ہی مشکل امر ہے کہ اس میں کسی عظیم نظریہ یا روح عصر کو کامیابی سے پیش کیا گیا ہے۔ادب کی دوامیت ،جاودانیت اور ابدیت کے لیے ضروری ہے کہ اس میں فکر کی گہرائی اور گیرائی کے ساتھ ادبی صفات اور عصری رجحان ومیلانات کی عکاسی پورے خلوص، دیانت اور فنی مہارت سے کی گئی ہو۔

بہر حال مجموعی طور پر بلوچی شاعری بیک وقت قومی اور بین الاقوامی طرز احساس کی شاعری ہے۔اپنا وطن اور وطن زادوں کی محبت سمیت پورے بنی نوع انسان سے محبت بلوچی شاعری کا مشترک جذبہ ہے۔بلوچ شاعروں کے نزدیک انسان کا عالم گیر تصور قومیتوں کے وجود، ان کی زبان، تاریخ، تہذیب اور ثقافت کی نفی کرنے سے نہیں بلکہ قومیتوں کے باہمی اشتراک اور احترام سے پیدا ہوتا ہے۔اس لیے ان کے یہاں اپنی زبان، تاریخ، تہذیب اور ثقافت کی بازیافت کا عمل ایک جزو کے طور پر کل میں ڈھلتا ہوا نظر آتا ہے۔

جدید بلوچی شاعری جمہوریت، امن، مساوات اور انسانی وقار واحترام پر یقین رکھتی ہے۔بلا کسی استثنیٰ کے تمام بلوچ شعرا کے یہاں یہی سوچ کارفرما نظر آتی ہے۔

کتابیات

۱ احمد زہیر، رپتیں زہیر، کراچی، پاذل اکادمی ۱۹۷۰ء

۲ احمد سلیم پروفیسر، ٹوٹتی بنتی اسمبلیاں اور سول ملٹری بیوروکریسی، لاہور، جنگ پبلشرز ۱۹۹۰ء

۳ اعظمی، خلیل الرحمٰن، اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک، علی گڑھ، ایجوکیشنل بک ہاؤس ۱۹۷۹ء

۴ بشیر احمد، لالہ وگران ناز، کوئٹہ، بلوچی اکیڈمی ۱۹۷۰ء

۵ بشیر بیدار، ھزام، کراچی، بلوچ کلچرل اینڈ ریسرچ ایسوسی ایشن ۱۹۹۰ء

۶ بگٹی، پروفیسر عزیز محمد، بلوچستان سیاسی کلچر اور قبائلی نظام، لاہور فکشن ہاؤس ۱۹۹۵ء

۷ بلوچ، غلام فاروق، نوکیں تام، کراچی، بلوچی لبزانک دیوان ۱۹۸۵ء

۸ Baloch, M. Sardar Khan, Literary History of the Balochis, (Vol.I) Quetta, Balochi Academy 1974.

۹ Baloch, M.S.K., Literary History of the Balochis (Vol. II) Balochi Academy.Quetta. 1984

۱۰ جعفری، ڈاکٹر سید حسنین محمد، احمد سلیم (مرتبین) پاکستانی معاشرہ اور ادب، کراچی پاکستان سٹڈی سنٹر جامع کراچی ۱۹۸۷ء

۱۱ جمالدینی، عبداللہ جان، بلوچستان میں سرداری نظام، کراچی، سید ہاشمی ریفرنس لائبریری ۲۰۰۰ء

۱۲ رشید امجد (ڈاکٹر)، مرتب، مزاحمتی ادب (اردو) اسلام آباد، اکادمی ادبیات پاکستان ۱۹۹۵ء

۱۳ رشید امجد (ڈاکٹر)، یافت ودریافت، لاہور، مقبول اکیڈمی شاہراہ قائداعظم ۱۹۸۹ء

۱۴ شوہاز بلوچ، جلبار، مسقط، بلوچ سنگت ادبی مجلس ۲۰۰۰ء

۱۵ شیخ، نور محمد (مرتب) میر گل خان نصیر: شخصیت، شاعری اور سیاست، کراچی، عوامی ادبی انجمن ۱۹۹۳ء

۱۶ شوہاز، غلام حسین جلبار، کراچی ۱۹۹۴ء

۱۷ شے رگام، شب روچ شپ، کوئٹہ، بلوچی پبلی کیشنز ۲۰۰۰ء

۱۸ صابر، غوث بخش، بلوچی زبان وادب کی مختصر تاریخ، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان پاکستان ۱۹۹۷ء

۱۹ صبا دشتیاری، انگریں واہگ، کراچی، سید ہاشمی ریفرنس لائبریری ۱۹۹۹ء

۲۰ صبا دشتیاری، گلکارءِ چکن کار، کراچی، بہارگاہ پبلی کیشنز ۱۹۹۰ء

۲۱ صدیقی، عقیل احمد، جدید اردو نظم.....نظریہ وعمل، علی گڑھ، ایجوکیشنل بک ہاؤس ۱۹۹۰ء

۲۲ عطا شاد، سنگاب، کوئٹہ، سیلز اینڈ سروسز ۱۹۸۵ء

۲۳ فیاض محمود، سید، (مدیر خصوصی) تاریخ ادبیات مسلمانانِ پاک وہند (جلد چہارم) لاہور،
پنجاب یونیورسٹی ۱۹۷۱ء

۲۴ قومی، عنایت اللہ، جگرءِ گپوت، پنجگور، عزت اکیڈمی ۲۰۰۰ء

۲۵ کامل القادری، مہمات بلوچستان، (جلد دوئم) کوئٹہ، نساٹر یڈرز ۱۹۸۰ء

۲۶ کامل القادری، بلوچی ادب کا مطالعہ، کوئٹہ، بولان بک کارپوریشن ۱۹۷۶ء

۲۷ کریم دشتی، شرگداری، کوئٹہ، زمانہ پرنٹنگ پریس ۱۹۶۳ء

۲۸ مری، جسٹس خدا بخش، قدیم بلوچی شاعری (اشاعت دوئم) کراچی ۱۹۷۶ء

۲۹ مری، شاہ محمد (ڈاکٹر) بلوچ قوم قدیم دور سے عصر حاضر تک، لاہور، تخلیقات ۲۰۰۰ء

۳۰ مری، شیر محمد، کہنیں شاحری، کوئٹہ، بلوچی اکیڈمی ۱۹۷۰ء

۳۱ نصیر، میر گل خان، بلوچستان کی کہانی شاعروں کی زبانی، کوئٹہ بلوچی اکیڈمی ۱۹۷۶ء

۳۲ نصیر، میر گل خان، بلوچی زرمیہ شاعری، کوئٹہ، بلوچی اکیڈمی ۱۹۷۹ء

۳۳ نصیر، میر گل خان، بلوچی عشقیہ شاعری، کوئٹہ، بلوچی اکیڈمی ۱۹۷۹ء

۳۴ نصیر، میر گل خان، تاریخ بلوچستان، کوئٹہ، روبی پبلیشر زرستم جی لین جناح روڈ ۱۹۸۶ء

۳۵ واحد بزدار، قدیم بلوچی شاعری کا تنقیدی جائزہ، اسلام آباد، قومی ادارہ برائے مطالعہ پاکستان ۱۹۹۷ء

۳۶ واحد بزدار، شاہیم کوئٹہ، بلوچی اکیڈمی ۱۹۹۸ء

۳۷ ہاشمی سید، بلوچی زبان وادب کی تاریخ، کراچی، سید ہاشمی اکیڈمی ۱۹۸۶ء

☆☆☆☆

مصنف کی دیگر کتابیں

۱۔ یادانی تاخ (ترتیب وتدوین)

۲۔ قدیم بلوچی شاعری کا تنقیدی جائزہ

۳۔ شاہیم

۴۔ ڈیہی ءِ دردوشم

۵۔ بلوچی اُردو بول چال

۶۔ بلوچی زبان وادب

۷۔ بلوچی راجمانز انتیگ گالبند

۸۔ بلوچی گالبند

۹۔ جدید بلوچی شاعری سے انتخاب

۱۰۔ فکر وفن

۱۱۔ شیرءِ ایراد

بلوچی سماج میں شاعری کا عمل کومٹ منٹ (Commitment) کا عمل ہے۔ میر بیورگ کے بقول شاعری صرف بہادر لوگ ہی کر سکتے ہیں۔ اُن کے نزدیک بزدل آدمی نہ تو شاعری کرسکتا ہے اور نہ ہی کوئی جنگ لڑسکتا ہے، کیونکہ بزدل آدمی نہ تو سماج سے کوئی کومٹ منٹ رکھتا ہے اور نہ ہی اپنی ذات سے۔

جدید بلوچی شاعری بھی ''محبت اور مزاحمت'' کی ایسی مرکزی روایت کے اردوگرد نہ صرف اپنے احساسات کا تانا بانا بُنتی نظر آتی ہے بلکہ وسیع کائناتی تناظر کا حاصل بھی ہے، جہاں مقامیت کے دکھ کے اظہار سمیت عالمی کرب بھی نمایاں ہے۔اور یہ کرب کومٹ منٹ کے بغیر ممکن نہیں ہے۔

بلوچی اکیڈمی کوئٹہ